# معارف

فروری ۲۰۱۶ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

# سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH**

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

## مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جزاور صفحہ نمبر۔

---

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

# معارف

جلد نمبر ۱۹۷ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۱۶ء | عدد ۲



دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

# شذرات

علی گڑھ تحریک اوراس کے زیر اثر مدرسۃ العلوم کی تاسیس جس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عظیم اورجمیل قالب اختیار کیا ایک عہد ساز واقعہ تھا۔اس نے نہ صرف عہد جدید میں برصغیر کے مسلمانوں کے علمی،فکری اورتہذیبی رجحانات اور رویوں کی تشکیل وتعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی اس خطہ کی تاریخ کا رخ متعین کرنے کے سلسلہ میں بھی اس کا کردار بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ۱۸۵۷ کے ناکام انقلاب کے بعد اس ملک میں ملت اسلامیہ جس دردناک صورت حال سے دوچار تھی اب اس کا صحیح ادراک بھی ممکن نہیں ہے۔کسی بھی قوم کی زندگی میں حکومت کی رفعت سے محکومی کی ذلت کا سفر بڑا جاں گسل اورصبر آزما ہوتا ہے۔اس کے نتیجہ میں جو نہایت پیچیدہ نفسیاتی مسائل جنم لیتے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی بصیرت، جرأت اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صفات پسپائی اور شکست خوردگی کے اعصاب شکن ماحول میں بہت کمیاب ہوتی ہیں۔ان مسائل سے موثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حالات کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اورنہایت باریک بینی سے علمی اور عقلی سطح پر ان اسباب وعلل کا پتہ لگایا جائے جو اس صورت حال کے لیے ذمہ دار ہیں۔ایک مغلوب ومفتوح قوم اپنی تاریخ کے اس نازک مرحلہ میں جس ذہنی اور جذباتی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے اس کے پیش نظر یہ کام اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے۔فاتح قوم اگر انتقام کے جنون میں مبتلا ہو جیسا کہ انگریز تھے،تو حالات کی سنگینی میں بدرجہا اضافہ ہوجاتا ہے۔ایسے روح فرسا حالات میں کسی بڑے کام کا حوصلہ کرنا تو الگ رہا زندگی خود ایک بوجھ بن جاتی ہے اور زندہ رہنے کی خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے۔ایسے ماحول میں کسی ایسے ادارہ کے تخیل کے لیے بھی غیر معمولی بصیرت، جرأت اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہوتی ہے جو قوم کی مردہ رگوں میں حیات بخش خون دوڑانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔سرسید نے ظلم و جبر کے تپتے ہوئے صحرا میں نہ صرف عالم تخیل میں ایک نخلستان کا خواب دیکھا بلکہ ان کے ناقابل تسخیر حوصلہ اور غیر متزلزل عزم نے ان حالات میں بظاہر اس ناممکن خواب کی تعبیر کا کارنامہ بھی انجام دیا اور اس طرح انجام دیا کہ وہ خود ایک مثال بن گیا۔جامع مسجد،اسٹریچی ہال اور وکٹوریہ گیٹ کو دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے

کہ یہ کسی لٹی پٹی قوم کے ہاتھوں تعمیر ہوئے ہیں۔ یہ غیر معمولی کوشش دراصل ماضی کی کھوئی ہوئی عظمت کی بازیافت کی خواہش کی غماز بھی تھی، حال کی تاریکی سے ایک روشن مستقبل کی طرف سفر کے عزم کا ایک استعارہ بھی اور آیندہ کے امکانات کی سمت میں ایک اشارہ بھی۔ جب سیاسی اقتدار ہاتھ سے جاتا رہا تو سرسید نے علم و دانش کی ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی ۔ یہ صرف ایک تعلیم گاہ نہیں تھی جہاں سرکاری ملازمتوں کے لیے درکار اسناد فراہم کی جاتی تھیں بلکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی کئی تہذیبی اور نفسیاتی ضرورتوں کی تکمیل بھی ہوتی تھی۔ سرسید کو ان بنیادی ضرورتوں کا ادراک بھی تھا اور ان کی تکمیل کے لیے کیا وسائل اختیار کیے جائیں اس کا شعور بھی۔ ادارہ کی حسین اور پرشکوہ عمارتوں کی تعمیر اسی شعوری کوشش کا ایک حصہ تھا۔ کسی خالص تعلیمی ادارہ کو قومی زندگی میں وہ مقام و مرتبہ نہیں مل سکتا جو برصغیر کے مسلمانوں کے ملی شعور میں علی گڑھ کو حاصل ہے۔ اپنے مخصوص تاریخی کردار کی وجہ سے یہ ادارہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی تشخص کی ایک علامت بن چکا ہے اور اس کی شبیہ ان کے لاشعور کی پہنائیوں میں مرتسم ہے۔ کوئی اور ادارہ ملی امیدوں، آرزوؤں اور عقیدت و محبت کا ایسا مرکز نہ بن سکا جیسا سرسید کا یہ ادارہ۔

---

جس وجہ سے اور جتنا یہ ادارہ مسلمانوں کو عزیز ہے اسی وجہ سے اور اتنا ہی وہ ان لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا ہے جن کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہی ناقابل برداشت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلق سے جو مسائل ان کی توجہ کے خاص مرکز رہے ہیں ان میں مسلم پرسنل لا کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ بھی شروع ہی سے شامل رہا ہے۔ ان کے اپنے تجزیہ کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کی جو علامات ہیں ان میں سے ایک نمایاں علامت مسلم یونیورسٹی ہے۔ اسی وجہ سے یہ مسئلہ بار بار اٹھتا رہا ہے۔ البتہ موجودہ حالات کے مخصوص تناظر میں اس بار اس کی سنگینی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور یہ ادارہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ حکومت وقت نے اس سلسلہ میں عدالت عظمیٰ میں جو موقف اختیار کیا ہے اس سے اس کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ پہلے بھی اس سلسلہ میں کوئی خاص ابہام نہیں تھا۔ اس مسئلہ کے سلسلہ میں انتہا پسند، فرقہ پرست تنظیموں کا موقف واضح ہے اور انہوں نے اسے کبھی بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک مدھم سی امید ضرور تھی کہ عدالت عظمیٰ میں یو۔پی۔اے حکومت نے جو موقف اختیار کیا تھا شاید سب

کا ساتھ سب کا وکاس کا نعرہ لگانے والے اس پر قائم رہیں خاص طور سے اس لیے کہ وہ کسی خاص پارٹی کا نہیں بلکہ حکومت کا موقف تھا اور عام طور پر حکومتی پالیسیوں میں ایک تسلسل ہوتا ہے اور برسر اقتدار پارٹیوں کی تبدیلی سے ان پر اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک کے اندر کوئی بھی بڑا ادارہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر حکومت کی یہ دلیل تسلیم کرلی جائے کہ جو ادارے پارلیمنٹ کی منظوری سے قائم ہوں گے ان کی شناخت اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے نہیں ہوسکتی تو پھر دستور نے اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کا جو حق دیا ہے وہ یکسر بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کیسے قائم ہوا اور اس نے یونیورسٹی کا درجہ کیسے حاصل کیا یہ عہد عتیق کی کوئی اساطیری داستان نہیں ہے جس کے لیے اثریات کے ماہرین کی شہادت درکار ہو۔ اس داستان عزیمت کا ایک ایک حرف محفوظ ہے اور دیدہ بینا اس دانش گاہ کے چپے چپے پر اسے دیکھ اور پڑھ سکتی ہے۔ یہ قافلہ شوق جہاں جہاں سے گذرا ہے اس کے نقش پا اب بھی روشن ہیں۔

---

مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی لڑائی اس وقت بنیادی طور پر ایک قانونی لڑائی ہے جو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں لڑی جائے گی۔ اس ملک کی یہ خوش قسمتی ہے کہ یہاں عدلیہ آزاد ہے اور انصاف کے تقاضوں کی پاسداری کرتی ہے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اس معاملہ میں بھی انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مقدمہ کو پوری مضبوطی اور مکمل تیاری کے ساتھ لڑا جائے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ اس کے باوجود یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ ان کوششوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہر وہ کوشش کی جائے جو حد امکان میں ہو اور ہر قیمت پر اس متاع گراں بہا کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے۔ ۱۹۶۵ سے ۱۹۸۱ تک ہندوستانی مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحفظ اور بحالی کے لیے جو بے مثال جدوجہد کی وہ ہماری ملی زندگی کا ایک نہایت روشن باب ہے اور اس کی ولولہ انگیز یادیں ابھی تک دل ودماغ میں تازہ ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ بات شک وشبہہ سے بالاتر ہے کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ ایک بار پھر اپنے اس عزیز ادارہ کے تحفظ میں کامیاب ہوگی اور اس سے ان دوسرے اداروں کی حفاظت کی راہ بھی ہموار ہوگی جن کا اقلیتی کردار خطرہ میں ہے۔

## مقالات

# علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مولانا شبلی نعمانیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مابین تعلقات کی سرگذشت

(۲)

ڈاکٹر سید سلمان ندوی

اشرف السوانح میں بھی ایسا ہی دلچسپ بیان ہے۔ چونکہ یہ مجلس کا وقت نہیں تھا اس لیے حضرت تھانوی گھر پر تھے۔ جیسے ہی خانقاہ میں لوگوں کو والد صاحب کے وہاں پہنچنے کا حال معلوم ہوا تو خاص خاص حضرات جیسے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب، خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب وغیرہ بھی مجلس میں آ گئے۔ اسی مجلس کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس کے بارے میں بڑی شہرت ہوئی۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ رخصت ہوتے وقت والد صاحب نے چپکے سے بہت آہستہ آواز میں حضرت تھانوی سے کچھ کہا۔ اس پر حضرت تھانوی نے جواب دیا، اس پر والد صاحب پر گریہ طاری ہو گیا اور اس کے بعد رخصت ہو گئے۔ حاضرین مجلس کو اس بات کی ٹوہ رہی کہ سید صاحب نے کیا کہا اور حضرت تھانوی نے کیا جواب دیا اور سید صاحب پر گریہ کیوں طاری ہوا۔ چنانچہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب کو اس بات کے لیے تیار کیا گیا کہ وہ جس وقت حضرت تھانوی میں انشراح دیکھیں تو ان سے پوچھ لیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ایک روز موقع پا کر حضرت تھانوی سے سوال کیا کہ سید صاحب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ حضرت نے جواب دیا کہ سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت

---

۱۸ کنگس ایونیو، ویسٹ وِلّی، ۳۶۲۹، کے، زیڈ، این، ساؤتھ افریقہ۔

کیجیے۔تو میں نے سوچا کہ اتنے بڑے عالم فاضل کو میں کیا نصیحت کروں تو اللہ نے القاء کیا اور میں نے یہ کہا کہ حضرت اس راہ کا پہلا قدم اپنے کو مٹا دینا ہے۔غرض پہلی مکاتبت ۱۹۳۰ء کے بعد نوبت ملاقات کی پانچ سال بعد ۱۹۳۵ء میں آئی۔اس ملاقات میں بھی اور اس کے فوراً بعد بھی بیعت کی درخواست نہیں کی۔بیعت کی نوبت تو بہت بعد میں آئی۔ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ۱۹۳۶ء میں پیش آیا جس نے تھانہ بھون سے تعلقات میں ایک بھونچال پیدا کردیا۔واقعہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۶ء میں ایک فتویٰ مولانا شبلی اور مولانا عبدالحمید فراہی کی تکفیر کا شائع ہوا۔اس فتویٰ پر مولانا تھانوی کے بھی دستخط تھے۔اس نے بڑا اضطراب والد صاحب کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری میں پیدا کردیا۔ہوا یہ کہ کسی نے مولانا شبلی کی الکلام میں سے فلاسفہ کے بعض عقائد باطلہ کو مولانا شبلی سے منسوب کرکے استفتاء مانگا اور مولانا فراہی کے قرآنی مطالب وتفسیر کے مسودہ میں سے تحریر مولانا امین اصلاحی نے بغیر نظر ثانی کیے ہوئے شائع کردی۔اس فتویٰ میں مولانا فراہی پر بھی تکفیر کا فتویٰ تھا والد صاحب کے لیے بڑا سخت مرحلہ تھا۔ایک طرف استاد کا اور مولانا فراہی کا معاملہ تھا اور دوسری طرف مولانا تھانوی سے تعلق ارادت کا معاملہ تھا۔اس کشمکش کی صورت حال کو ظاہر کرنے کے لیے میں نے غالب کے شعر میں کچھ ترمیم کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے ؎

احساں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے علم + اشرف میرے پیچھے ہے تو شبلی میرے آگے

والد صاحب کو افسوس تھا کہ حضرت تھانوی نے اپنی شفقت کے باوجود کیوں نہ صحیح حقیقت معلوم کرلی۔والد صاحب نے بالآخر استاد اور مولانا فراہی کے دفاع میں ایک مضمون غوغائے تکفیر کے نام سے مزاج کے خلاف بہت سخت لکھا اور یہ مضمون مولانا ظفر احمد عثمانی کو مخاطب کرکے لکھا گیا تھا۔اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ جن عقائد کی بنا پر تکفیر کی گئی ہے وہ مولانا شبلی کے نہیں ہیں بلکہ فلاسفہ قدریہ کے ہیں اور غلط طور پر ان کو مولانا شبلی کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔مولانا فراہی کی تحریر کے بارے میں بھی تشریح کردی گئی کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا فراہی کے ذاتی مسودہ سے بغیر تحقیق ونظر ثانی کے تحریر شائع کردی۔اس مضمون کی سختی کا اندازہ اس مضمون کے آخری جملہ سے کیا جاسکتا ہے۔یہ لکھا کہ مولانا شبلی اب اس بارگاہ میں ہیں جہاں وہ میرے آپ کے مناقشہ سے بے نیاز ہیں۔آپ کا اصرار جرم مولانا شبلی کو جنت سے جہنم میں نہیں پھینک سکتا اور میری اصرار براءت ان کو

جہنم سے جنت میں نہیں پہنچا سکتی والسلام علیکم الی یوم التلاق۔ یہ مضمون تھانہ بھون کے النور میں بھی شائع ہوا۔ اس واقعہ سے طرفین میں تلخی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا دریابادی اور والد صاحب کی کوششوں سے صحیح صورت حال واضح ہونے سے تھانوی نے اس فتویٰ سے رجوع کیا اور اپنے ہی رسالہ ترجیح الراجح میں یہ رجوع شائع کر دیا۔ یہ ساری تفصیل مولانا دریابادی کی مکتوبات سلیمانی اور حکیم الامت میں موجود ہے۔ اس قضیہ نامرضیہ کے ختم ہوتے ہوتے بھی ایک سال لگ گیا۔ مولانا تھانوی نے رجوع کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جب کوئی کسی کتاب کا اقتباس بھیج کر فتوی مانگتا ہے تو میں اصل کتاب منگوا کر دیکھ لیتا ہوں۔ اس مرتبہ میں نے یہ نہیں کیا اور مفتی کفایت اللہ صاحب کے دستخط پر اعتماد کر کے دستخط کر دیے۔ جب جب میں نے اپنے اصول سے انحراف کیا ہے تو مجھے پچھتانا پڑا ہے۔ غرض حضرت تھانوی سے عقیدت کے باوجود جب استاد پر زد پڑی تو ان کے دفاع میں قلم اٹھالیا۔ اس کے بعد پھر تھانوی سے تعلقات میں استحکام پیدا ہوا۔ پھر ۱۹۳۵ء کی ملاقات کے بعد اور ۱۹۳۶ء کے فتوی تکفیر کے بعد دوسری ملاقات کی نوبت لکھنؤ میں آئی اور بیعت کا سلسلہ اب بھی شروع نہیں ہوا۔

مولانا تھانوی ایک عرصہ سے علیل تھے اور مرض میں افاقہ نہیں تھا۔ مشورہ دیا گیا کہ لکھنؤ جا کر علاج کرایا جائے۔ چونکہ وہاں طبی سہولتیں ہر قسم کی موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہاں شفاء الملک حکیم عبدالحمید صاحب بھی ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۸ء میں حضرت کا سفر لکھنؤ کا ہوا اور علاج کے سلسلے میں کئی ہفتے کا قیام رہا۔ والد ماجد کو علالت کی اطلاع مل رہی تھی تو وہ حضرت تھانوی سے ملنے کے لیے تھانہ بھون چلے گئے جب وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت لکھنؤ میں ہیں تو والد صاحب لکھنؤ آئے اور حضرت تھانوی سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تعلقات گذشتہ کی طرح پھر ہموار ہو گئے اور طرفین سے وہی لطف و عنایت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن نوبت ابھی بھی بیعت کی نہیں آئی مگر اس درمیان تعلقات میں بڑی استواری آ گئی۔

حضرت تھانوی کے سفر کی روداد اور کن لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ رہا اس کی تفصیل جناب وصل بلگرامی کے مرتب کردہ سفر نامہ لکھنؤ و لاہور میں موجود ہے۔

والد ماجد کا رجحان اب مکمل طور سے حضرت تھانوی کی طرف ہو چکا تھا اور طرفین میں خطوط کے تبادلہ میں ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ ادھر تو یہ حال تھا،

اُدھر والد ماجد کے معتقدین میں بڑا اضطراب تھا اور کہہ رہے تھے کہ سید صاحب میں کیا کمی تھی جو ادھر تھانہ بھون کا رخ کررہے ہیں۔ والد صاحب نے جواباً کہا کہ میں نے اپنے میں کچھ کمی پائی تب ہی تو تھانہ بھون کا رخ کیا ہے۔ پھر کہا کہ لوگ ویسے مجھے علامہ کہتے ہیں اور جو کام کررہا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ بیوقوفی ہے۔ مخالفین یا عقیدت مندوں کے قولی اضطراب کی تفصیل طویل ہے اور کئی نام لیے جاسکتے ہیں۔ تفصیل کے ڈر سے اس بحث کو طویل نہیں دینا چاہتا۔

والد ماجد اور حضرت تھانوی کے درمیان تعلقات میں اب اتنا استقلال آچکا تھا کہ بالآخر وہ وقت آہی گیا جب بیعت کی درخواست کرہی دی۔ اس پر حیرت شاید ہو کہ تعلقات کی ابتدا تو ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور ہوتے ہوتے بیعت کی درخواست کی نوبت ۱۹۴۱ء میں آئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سربراہ کا دیوبند سے متعلق حضرت تھانوی کے یہاں جانا معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ۱۹۳۶ء میں شبلی وفراہی کی تکفیر میں بھی دیوبندی عنصر شامل تھا۔ چنانچہ مولانا دریابادی کے نام ایک خط میں بہت صفائی کے ساتھ والد صاحب نے حسب ذیل جملہ تحریر کیا تھا:

> ''مولانا شبلی کی تکفیر کا اتنا غم نہیں کہ وہ متکلم تھے اور وہ کون متکلم ہے جو کافر نہ بنا۔ غم مولانا حمیدالدین صاحب کی تکفیر کا ہے۔ جن کو ہم لوگ دیوبند کے بڑے بڑے اکابر سے علم وفضل اور زہد واتقاء میں کم تر نہیں جانتے''۔ (مکتوبات سلیمانی جلد دوم، ص ۵۳۔ ۵۴)

اسی ۱۹۳۶ء کا ایک اور اقتباس بھی اس ندوہ و دیوبند والی کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔ اقتباس طویل ہے مگر دلچسپ ہے۔ ایک تو مسئلہ تکفیر کا تھا اور دوسرا مسئلہ والد صاحب کے بعض قرآنی آیات پر اعتراض کا تھا اور اس پر حضرت تھانوی کی تقریظ بھی تھی۔ مولانا دریابادی کو والد صاحب نے خط میں اس طرف توجہ دلائی:

''..... مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں جس جس طرح ان لوگوں سے قریب ہونا چاہتا ہوں ویسے ہی وہاں سے دور باش کی غیر متوقع صدا کیوں آجاتی ہے؟ کیا مولانا تھانوی مدظلہ اس شفقت کے باوجود جو میرے ساتھ ہے۔ مجھ پر اس قدر کرم نہیں فرما سکتے تھے کہ اس مجرم سے دریافت فرما لیتے۔ بہ خدا اگر مولانا (تھانوی) کی تقریظ نہ ہوتی تو ان سب علماء کو میں چیلنج دے دیتا۔ تعجب ہے کہ

اس قسم کی باتیں اکابر دیوبند نے لکھیں تو عین ایمان اور میں نے لکھیں تو مسامحات۔ خاتم النبیین کی تفسیر جو مولانا قاسم صاحب نے فرمائی اور سراجاً منیراً کی تفسیر جو مولانا تھانوی نے فرمائی ہے وہ عین محبت نبوی کا تقاضا مگر میں نے آیت شاہداً و مبشراً و نذیراً کی تفسیر کی تو غلط یا للعجب۔ وہ تخلف وعید کو (جس کو امکان کذب باری کا نام دیا گیا) ممکن کہیں تو ایمان اور اسی بات کو یوں کہہ دیا کہ کفار ممکن ہے دوزخ سے نکالے جائیں تو الحاد ہو جائے۔ طبع ثانی میں مسئلہ خلود نار حسب رائے جمہور پہلے ہی اضافہ کر دیا ہے اور اس کو تین سال ہوئے''۔ (مکتوبات سلیمانی جلد دوم، ص ۶۳ - ۶۴)

اس خط میں اور بھی تفصیل ہے اور ایک پر درد جملہ قلم سے نکل گیا کہ مجھے تو شک ہے کہ ان صاحبوں کے دلوں سے عصبیت، دیوبندی وندوی نہیں گئی۔ اس خط پر مولانا دریابادی کا حاشیہ بھی بہت درد سے بھرا ہوا ہے۔

بہر حال دس سال بعد یہ نوبت آئی کہ بالآخر ۱۹۴۱ء کے آخر میں بیعت کی درخواست کی جو قبول ہوئی ؎

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

مولانا تھانوی کے خلیفہ اجل ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے بیعت کے بعد والد صاحب کے متعلق یہ اشعار کہے ؎

بہت چاہا نہ ظاہر ہو کسی پر راز ضبط غم + دو آنسو کہہ گئے لیکن شکست دل کا افسانہ

(اس شعر میں اشارہ ہے ۱۹۳۵ء والی ملاقات کا جس میں حضرت تھانوی کی نصیحت کے جواب میں والد صاحب پر گریہ طاری ہوا تھا)

نہ چھوڑا شائبہ تک دل میں احساس دو عالم کا معاذ اللہ محبت کا یہ انداز حریفانہ
خبر کیا تھی بنائے گی محبت ایسا دیوانہ مجھے بننا پڑے گا خود محبت کا ہی افسانہ

بیعت کے بعد کی پہلی غزل والد صاحب کی ۱۹۴۲ء کی ہے۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غزلوں کے مجموعہ کا دو حصہ ہے۔ ایک مولانا تھانوی سے تعلق سے پہلے کا ہے اور ایک تعلق کے بعد کا ہے۔ یہ پورا مکمل مجموعہ غزل الغزلات کے نام سے والد ماجد کے انتقال کے بعد شائع ہوا، پھر حال ہی میں اس کا بہت خوبصورت دوسرا ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں

ابتدائی دور کی وہ غزل بھی ہے جس کے ایک شعر پر داد علامہ اقبال نے بھی دی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں + وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

حضرت تھانوی سے بیعت کے بعد کی پہلی غزل ۱۹۴۲ء کی ہے اور اپنے اس دور کی شاعری کے متعلق اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جس کے لیے اپنا ہاتھ اپنے شیخ طریقت کے ہاتھ میں دیا:

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوش مند ہیں + مستی مری یہ بادۂ انگوری نہیں

بیعت کے بعد کی پہلی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں + ہر سود و زیاں دوسرا بھول گیا ہوں
عالم کے تماشے نہیں اب جاذب دل ہیں + ہر لذت ہستی کا مزا بھول گیا ہوں
الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا + افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں
اے خضر مرا قافلہ کسی سمت چلا ہے + تمیز صدا ہائے درا بھول گیا ہوں

چونکہ شیخ کی خدمت میں دیر سے پہنچے اور اس وقت پہنچے جب حضرت تھانوی کی عمر ۸۰ برس کی ہو چکی تھی تو اس سے متعلق یہ شعر کہا:

سازگار اب گردش ایام ہے + درد میں ہشتاد سالہ جام ہے
اب در پیر مغاں چھوٹے نہیں + اس کی مٹی میں بھی کیف جام ہے
فیض ہے یہ کسی ولیٔ وقت کا + اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

پھر اس کے بعد شیخ سے درخواست کی:

دور سے آیا ہوں ساقی دیر سے آیا ہوں میں + ہو عطاء خاص مجھ کو جو عطاء عام ہے

پھر ۱۹۴۲ء کی ہی ایک غزل کا شعر ہے جس میں دنیاوی جاہ و عزت سے بے اعتنائی کا احساس نمایاں ہے:

علم و دولت جاہ و عزت ہیچ ہیں
گر مجھے حاصل ترا انعام ہے

۱۹۴۱ء کے آخر میں بیعت ہوئے۔ تزکیہ واحسان کے مدارج اتنی تیزی سے حاصل کیے

کہ شیخ طریقت نے ۱۹۴۲ء کے اکتوبر میں خلافت کے انعام سے سرفراز کیا۔ حضرت تھانوی کے مریدین و خواص طریقت کے لیے یہ بہت ہی غیر معمولی واقعہ تھا کہ کسی کو ایک سال کے اندر ہی خلافت سے نوازا جائے۔ ورنہ پندرہ بیس سال سے لوگ وہاں خانقاہ میں اس انعام سے محروم تھے۔ مریدین میں اس پر چہ میگویاں بھی ہوئیں اور یہ بات مولانا تھانوی تک بھی پہنچی۔ تو جواب دیا کہ ''تم لوگ گیلی لکڑی ہو دیا سلائی دکھاتے ہیں اور صرف دھواں نکلتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ سید صاحب خشک لکڑی تھے دیا سلائی دکھائی، تو فوراً جل اٹھے''۔

والد ماجد کی خلافت کا معاملہ بھی خوب ہے۔ تھانہ بھون کے قیام کے دوران حضرت تھانوی نے ایک رقعہ ان کو بھیجا کہ آپ کو خلافت مجاز بیعت دینا چاہتا ہوں۔ والد صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تو ایک دو روز کے بعد پھر یاددہانی کا رقعہ بھیجا کہ میں نے آپ سے کچھ استشارہ کیا تھا اس کا جواب نہیں ملا۔ تو والد صاحب نے جواب دیا کہ ''میرے پیروں تلے زمین نکل گئی، میں تو بالکل نو وارد ہوں میں اس کا اپنے آپ کو مستحق نہیں سمجھتا۔ حضرت کا جواب آیا کہ الحمدللہ جواب حسب توقع آیا اور میں آپ کو اس کا مستحق سمجھتا ہوں۔ خلافت ملنے کے بعد پہلی جو غزل ہے اس میں یاد دلایا ہے کہ تزکیہ و احسان کی تکمیل میں خلافت بھی سیکھنے اور سکھانے کی راہ کو آسان کرتی ہے بشرطیکہ اخلاص ہو۔ پہلی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ۲۲/اکتوبر ۱۹۴۲ء کی غزل ہے:

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے　+　اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے
جو آج لذت درد نہاں کا جویا ہے　　وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغ دار کرے
سنا تو دے اسے افسانۂ غم ہجراں　　وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

اس غزل کا عنوان ہے بہ تقریب عطائے خلافت۔ اس غزل کے فوراً بعد کی غزل ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۲ء کی ہے۔ اس میں مناجات ہے اور راہ کی تکمیل کی دعا ہے۔

صدق احساس کی دولت میرے مولا دے دے　　غم امروز بھلا دے غم فردا دے دے
کھول دے میرے لیے علم حقیقت کے در　　دل دانا دل بینا دل شنوا دے دے
قول میں رنگ عمل بھر کے بنا دے رنگیں　　لب خاموش بنا کر دل گویا دے دے
دل بیتاب ملے دیدۂ پر آب ملے　　تپ آتش مجھے دے دے نم دریا دے دے

درد دل سینے میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دے دے

حضرت تھانوی کا دستور تھا کہ اپنے خاص خلفاء کو ہدیہ سے نوازا کرتے تھے۔ چنانچہ ۸/ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء) کو حضرت تھانوی نے والد صاحب کو اپنی استعمال کی ہوئی ایک صندل کی تسبیح تحفہ میں دی، اس پر والد ماجد کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ اس کا عنوان ہے بہ تقریب عطائے شیخ سبحۂ اقدس بہ ایں فقیر

خواجہ بخشید مرا سبحۂ صد دانہ بہ لطف + دانہ انداخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت تھانوی نے ۲۸/شوال ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲) کو والد صاحب کو ایک چھڑی عنایت فرمائی۔ اس قطعہ کا عنوان ہے بہ تقریب عطائے شیخ عصاء اقدس بہ ایں فقیر

سلیماں بودم و در دست منساتم نمی دادند مرا از لطف حق در دست خواجہ داد منساتم
دگر چوں لطف حق خواہد مرا نقش و نگیں بخشد ہماں نقش و نگیں کو ملک معنی را بود خاتم

(قرآن میں عصائے سلیمانی کے لیے منسات کا لفظ ہے)

جب چھڑی کا تحفہ دیا تو حضرت نے اس کے ساتھ جو اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ بھیجا اس میں یہ تحریر کیا: راحت جاں راحت جسم کا سامان بھیج رہا ہوں۔ اس پر والد صاحب نے تحریراً جواب دیا کہ اس سے استقامت علی الدین کی تعبیر لیتا ہوں حضرت نے جواباً تحریر کیا کہ میرے ذہن میں ایک اور بھی تعبیر ہے کہ اس سے عصائے موسوی کا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ۱۹۴۳ء کے آغاز سے ہی حضرت تھانوی کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بالآخر مرض الموت ہی بن گیا اور اسی علالت میں حضرت تھانوی کا انتقال ۱۵/رجب ۱۳۶۲ھ (۱۹/جولائی ۱۹۴۳ء) کو ہو گیا۔ حضرت تھانوی سے والد ماجد کی آخری ملاقات ۷/تا ۱۱/جولائی ۱۹۴۳ء تھانہ بھون میں رہی پھر والد ماجد صاحب ایک سرکاری کمیٹی کی میٹنگ کے سلسلہ میں بھوپال روانہ ہو گئے۔ بھوپال سے واپسی لکھنؤ کے لیے ۲۳/جولائی کو ہوئی اس دوران سفر حضرت تھانوی کا انتقال ہو گیا اور والد ماجد اس حادثہ سے بے خبر تھے۔ میں ندوہ میں اس زمانہ میں زیر تعلیم تھا اور مجھے ان کی لکھنؤ آمد کی تاریخ و وقت کا علم تھا۔ ادھر ندوہ میں حضرت تھانوی کے انتقال پر چھٹی ہو گئی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی والد ماجد ندوہ پہنچے میں نے ان کو انتقال کی خبر دی وہ سن کر بہت غم گرفتہ اور بالکل چپ

ہوگئے۔ مجھے اس وقت دس گیارہ برس کی عمر میں نہ تو حضرت تھانوی کی شخصیت کا علم تھا اور نہ ہی حضرت کے ساتھ والد ماجد کے تعلقات کی گہرائی کا علم تھا لیکن اتنا ہوا کہ جب والد صاحب نے حضرت تھانوی پر نثری نوحہ لکھا تو میرا نام دے کر ذکر کیا کہ ''میں حادثہ سے بے خبر تھا مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچہ سلمان سلمہ نے سب سے پہلے خبر دی''۔ اس نثری نوحہ کا عنوان والد صاحب نے موت العالم موت العالَم رکھا اور یہ پورا مضمون یادِ رفتگاں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شیخ کے انتقال پر جو اشعار کہے ہیں اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ استاد کے انتقال پر جس غم واندوہ اور درد کا اظہار کیا تھا اس میں شیخ کی تربیت سے خاصا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ غم و مایوسی کا جو اظہار اور جذبات کا جو تلاطم استاد کے نوحہ میں تھا اس میں رحلت شیخ کے وقت کتنا ٹھہراؤ تھا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

داغ فراق یار مٹایا نہ جائے گا　+　اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حرف دم وداع خدا کے سپرد ہو　+　تا آخر حیات بھلایا نہ جائے گا

پیر مغاں نہیں ہے مگر میکدہ تو ہے　+　جام وسبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا

اے میکشو یہ درد تہہ جام بھی پیو　+　ترسو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا

اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے
نقش دوام فیض مٹایا نہ جائے گا

مندرجہ بالا آخری شعر کے پہلے خط کشیدہ مصرعہ کے الفاظ کا تقابل اگر نوحہ استاذ کے حسب ذیل مصرعہ اور شعر سے کیجیے تو فوراً فرق سمجھ میں آ جائے گا ؎

کیا فریب صبر کھائے غم نصیب دل فگار　+　جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار

تربیت شیخ نے تزکیہ واحسان کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا، جہاں رضائے الٰہی کے آگے خود سپردگی اور خود احتسابی کا وہ انعام حاصل کر لیا تھا جس کی تلاش کا آغاز ۱۹۳۰ سے ہوا تھا۔ جولائی ۱۹۴۲ء کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اُدھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں

جو موسیٰ بھی ہوں تو بھی اتباع خضر لازم ہے
ہدایت منحصر ہے اتباع شیخ کامل میں
مرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں
لگادے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل میں

حضرت تھانوی سے اتنے عمیق تعلق کے بعد یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ نقش اول جو مولانا شبلی کی صحبت و تربیت میں دل پر نقش تھا اس میں کوئی کمی تا آخر حیات نہیں ہوئی۔اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ فقہی معاملات میں توسع کا دامن کبھی بھی نہیں چھوٹا۔خود حیات شبلی کی تصنیف کا زمانہ اور اس کی تکمیل کا زمانہ بھی وہ ہے جب حضرت تھانوی سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم ہو چکا تھا۔حیات شبلی کا مقدمہ اس پر شاہد ہے۔میں نے ایک بار والد ماجد سے سوال کیا کہ یہ بتائیے اور صاف کھل کر بتائیے کہ آپ کانگریسی ہیں یا لیگی ہیں۔کیونکہ آپ کا تعلق دونوں ہی گروہ سے ہے۔تو بڑا دلچسپ مگر حقیقت سے بھرا ہوا جواب دیا۔کہا دماغ کانگریسی ہے اور دل لیگی۔یہ اشارہ مولانا شبلی کے کانگریس کے رجحان کی طرف تھا اور مولانا تھانوی کا رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا۔

اسی طرح فروری ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے والد ماجد کو آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا ارادہ کیا۔والد صاحب کے ساتھ ہی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو بھی ڈگری دی جانی تھی۔والد صاحب نے مولانا تھانوی کو خط لکھ کر مشورہ مانگا اور یہ لکھا کہ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا مجھے الحمدللہ اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔شیخ طریقت نے جواب دیا کہ آپ ضرور قبول کریں اور اس نیت سے کریں کہ آپ کے ڈگری قبول کرنے سے انگریزی جامعہ کا چٹائی والوں کے علم و فضل کا اقرار ہوگا۔جب ڈگری مل گئی تو شیخ کو اطلاع دی اور یہ لکھا کہ جس وقت مجھے گاؤن پہنایا گیا اور ڈگری عطا کی گئی تو اس وقت الحمدللہ قلب میں ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہ ہوا۔اس سے زیادہ دلچسپ مرحلہ وہ آیا جب انجمن ترقی پسند مصنّفین کانفرنس کے بھوپال میں افتتاح کی درخواست کی گئی تھی۔اس کانفرنس کا اہتمام بھوپال ہی کے مشہور شاعر جاں نثار اختر اور ان کی بیگم کے ہاتھ میں تھا۔والد صاحب نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا اور افتتاحی خطبہ پیش کیا۔اس کانفرنس کے شرکاء میں جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، عصمت چغتائی جیسی ممتاز ادبی شخصیات شریک

تھیں۔اس خطبہ کا افتتاحی جملہ یہ تھا: ترقی پسند اہل قلم کیا کہتے ہیں اور کیا بلاوا دیتے ہیں اور ان کے دل میں کیا ہے اور کیا چاہتے ہیں اس کے متعلق کچھ اچھی اور کچھ بری باتیں میں نے سنی ہیں لیکن خود میری زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس میں شریک ہورہا ہوں ۔ یہ پورا خطبہ معارف مئی ۲۰۱۵ء کے شمارہ میں شائع ہوچکا ہے یہ پورا خطبہ پڑھنے کے لائق ہے۔اس میں شبلی کی زبان وقلم کی جھلک ملے گی۔اس میں حافظ شیرازی، خیام، فرخی کا ذکر ہے، اقبال کا تذکرہ ہے۔اکبر، اسماعیل میرٹھی وشبلی کا ذکر ہے۔خطبہ کا آخری جملہ یہ تھا۔بوڑھوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھاؤ بوڑھے حافظ کا مشورہ ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

اس کانفرنس میں شرکت وصدارت حضرت تھانوی کے خلیفہ کی حیثیت سے تو شاید سمجھ میں نہ آسکے لیکن شبلی کے شاگرد کی حیثیت سے یقیناً سمجھ میں آسکتی ہے۔اسی طرح حضرت تھانوی سے تعلق کے بعد بھی علمی سرگرمیاں معارف کی اشاعت ونثری نوحوں کا اہتمام اور مختلف علمی کانفرنسوں اور علمی اجتماعات میں شرکت اور ندوۃ العلماء کی تعلیمی سرگرمیوں کے اہتمام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ استاد کی وصیت کے مطابق اپنے استاد کی سوانح عمری بھی اپنی علمی کاوشوں کے آخر میں لکھی جیسا مولانا شبلی نے کہا تھا جب سب کام سے فارغ ہو تو تم ہی میری سوانح لکھ دینا۔

شبلوی فکر وندوہ کی فقہی وسعت کا مزاج آخر حیات تک قائم رہا اور مولانا شبلی کا دیا ہوا عمامہ آخر تک عید وبقرعید میں اہتمام کے ساتھ باندھتے رہے۔ یادرفتگاں میں ان کا آخری مضمون وفیات کے عنوان کے تحت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب پر دسمبر ۱۹۵۲ء کا ہے۔

ذاتی زندگی میں یقیناً حضرت تھانوی سے تعلق کے بعد تبدیلی اس حیثیت سے ضرور ہوئی کہ خود احتسابی بڑھ گئی تھی اور ذکر صبح گاہی وتہجد کا اہتمام جاری رہا۔ مجھے ذاتی طور پر ان کے خود احتسابی وتقویٰ کے کئی معاملات کا علم ہے اور مشاہدہ بھی ہے۔اگر ان واقعات کا ذکر کروں تو یہ تحریر طویل سے طویل تر ہوجائے گی۔

ایک قابل ذکر واقعہ ضروری ہے جو بیان کیا جائے۔ترقی پسند مصنّفین کے جس اجتماع کا اوپر ذکر کیا ہے اس میں جوش ملیح آبادی بھی شریک تھے۔کانفرنس میں تو سب ہی ہندو اور مسلمان

مصنّفین بڑی گرم جوشی اوراحترام سے والد صاحب سے ملے۔لیکن اسی کانفرنس کے دوران جوش کی بڑی گستاخانہ نظم بھوپال کے مسلم اخبار ندیم میں شائع ہوئی۔شام کو جب یہ اخبار ہمارے گھر پر آیا تو والد صاحب کی نظر اس نظم پر پڑی تو بے چین ہوگئے اوراسی رات کو اس نظم کے جواب میں ترکی بہ ترکی جواب دیا اور دوسرے ہی دن یہ جوابی نظم ندیم اخبار میں شائع ہوگئی۔جوش کی نظم کا عنوان تھا ''ہوں'' اور جوش کی نظم ۱۴۔اشعار میں تھی۔جوابی نظم میں ۱۵۔اشعار شائع ہوئے۔جوش نے اپنی نظم میں اللہ تعالیٰ کو ''آسمانی باپ'' سے خطاب کیا تھا۔والد صاحب کی جوابی نظم میں جوش کے ہر شعر کا جواب دیا گیا تھا۔بعد میں جوش کی نظم کا عنوان ''شرار بولہبی'' رکھا اور جوابی نظم کا عنوان ''چراغ مصطفوی'' رکھا۔ جوش کی پوری نظم میں یہ کہا گیا تھا کہ دنیا میں جو فسادات اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے اس پر ''ہمارا آسمانی باپ'' ہوں کیوں نہیں کرتا،جیسے بچے جب شرارت کرتے ہیں تو باپ کی ایک ''ہوں'' سے سب خاموش ہوجاتے ہیں۔دو تین جوش کے اشعار پڑھیے اوراس کا جواب بھی پڑھیے:

| والد صاحب | جوش |
|---|---|
| باپ کی ہوں سے سنبھل جاتے ہیں فرزند سعید | جب کہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خروش |
| ناخلف جو ہیں نہیں سنتے ہیں تہدید و وعید | باپ کی صرف ایک ''ہوں'' نے کردیا سب کو خموش |
| اس جہاں میں جو مصیبت پیش آئی ہے کہیں | ''ہوں'' بزرگ خانداں کی آہنی دیوار ہے |
| وہ بجز تنبیہ رب العالمین کچھ بھی نہیں | ہر فساد و غلغلہ کو ایک ''ہوں'' درکار ہے |
| نسل سے چنگیز کی سلطان دیں پیدا ہوا | جب ہلاکو نے بہائی تھیں لہو کی ندیاں |
| ظلمت تاتار سے نور مبیں پیدا ہوا | کوئی ''ہوں'' اس وقت کیا گونجی تھی زیر آسماں |

پوری نظم دونوں ہی پڑھی جائیں تو اندازہ ہوگا یہ پوری نظم غزل الغزلات میں موجود ہے۔ لیکن والد ماجد کی نظم کا پندرہواں شعر حاضر ہے ؎

بے بصر کو کیا خبر ہوتا رہا ہے بار بار + تیرگی سے نور شر سے خیر یوں ہی آشکار

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک لطیفہ بھی سن لیجیے جس میں شبلی کے طرف دار اور مخالف کی چشمک پر لطیف اشارہ بھی ہے اور طنز بھی۔ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو کا قیام حیدرآباد میں تھا۔والد صاحب کا سفر اکثر حیدرآباد کا ہوتا تھا ایک مرتبہ والد صاحب حیدرآباد گئے ہوئے تھے تو

ڈاکٹر عبدالحق سے ملنے ان کے گھر پر گئے۔ تو ملازم سے بغیر نام بتلائے ہوئے اطلاع کروائی تو ڈاکٹر صاحب نے ملازم سے کہا کہ نام پوچھ کر آؤ۔ والد صاحب نے ملازم سے کہا کہ ان سے کہنا کہ ان کا حریف آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے باہر آئے اور کہا کہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ "سید سلیمان" کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ طرفین کی چشمک اور اپنے اپنے "ہیرو" کی تعریف و دفاع ایک طرف مگر اس کا کوئی اثر ذاتی تعلقات پر نہیں پڑا۔ اس کے کئی واقعات کا مجھے علم بھی ہے اور مشاہدہ بھی ہے۔ مضمون اور طویل ہو جائے گا اس لیے ان کا ذکر نہیں کرتا۔ جب والد صاحب کراچی ۱۹۵۰ء میں گئے اور اضطراری ہجرت ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اپنی انجمن ترقی اردو کے دفتر میں بہت عظیم الشان دعوت کا اہتمام والد ماجد کے اعزاز و استقبال میں کیا۔

میں نے والد ماجد کے مولانا تھانوی سے تعلق اور مولانا شبلی سے عقیدت کے سلسلہ میں کئی واقعات کا ذکر قصداً چھوڑ دیا کہ مضمون طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ آخر میں والد ماجد ہی کے حسب ذیل اشعار پر یہ مضمون ختم کرتا ہوں۔ زبانی اس موضوع پر گفتگو یا بیان کا موقع ملا تو اس پر مزید روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

چل کھڑا ہو رہنما سے پوچھ کر راہ سفر + بحث میں الجھا مسافر تو سفر ناکام ہے

ہے "نہیں" بھی ربط پنہاں نیاز و ناز عشق + لن ترانی امتحان شوق کا پیغام ہے

اُف ری دریائے معاصی کی تلاطم خیزی + وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں

ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسم گل میں توبہ + جو نہ ٹوٹے مرے غفار کہاں سے لاؤں

رات کو خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی + ایسی بدمستیٔ توبہ سے الٰہی توبہ

توبہ گن گن کے نہ کر دانۂ تسبیح پہ شیخ + جرم ہے ناتناہی متناہی توبہ

صدق احساس کی دولت میرے مولا دے دے + غم امروز بھلا دے غم فردا دے دے

قول میں رنگ عمل بھر کے بنا دے رنگیں + لب خاموش بنا کر دل گویا دے دے

درد دل سینے میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دے دے

# قتل عمد میں معافی اور امت کا موقف

جناب بدر احمد مجیبی

(۲)

**شریعت میں سنت مستقل حیثیت رکھتی ہے:** احکام کی تشریع میں سنت کی خود مستقل حیثیت ہے۔اس سے احکام کا استنباط ہوتا ہے۔مجتہدین کرام اس سے مسائل اخذ کرتے ہیں۔ سنت کو کتاب اللہ کے تابع ماننا،اس کو قرآن سے مستفاد قرار دینا اور احادیث کو قرآن پر پیش کرنے کو ضروری سمجھنا یہ نظریہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔قرآن میں کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جس سے مراد سنت نبوی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَ اَنْزَلَ اللّٰهِ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۵۸) | اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی۔ |
| كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔(۵۹) | جیسے ہم نے تم لوگوں میں تم میں سے ایک رسول کو بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہارا تزکیہ کرتے ہیں اور تم لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ |
| وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ۔(۶۰) | اور اپنے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور جو اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے۔ |
| لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ | بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب |

خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار۔

فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۔(۶۱)

ان میں ان ہی میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا جو اللہ کی آیات انہیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ ۔(۶۲)

اسی نے امیوں میں ان میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا جو انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

وَ اذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِکْمَةِ ۔(۶۳)

یاد کرو اللہ کی آیات اور حکمت کو جو تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی ہیں۔

ان آیات میں مفسرین کرام کے نزدیک حکمت سے مراد سنت ہے۔ اس کو کتاب اللہ سے علاحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اگر اس کی مستقل حیثیت نہ ہوتی اور وہ صرف قرآن ہی سے مستفاد ہوتی تو اس کو علاحدہ کیوں بیان کیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اور سنت دونوں نازل کی۔ رسول ﷺ لوگوں کو کتاب اور سنت دونوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ صرف کتاب اللہ کا ذکر کر دیا جاتا۔ سنت اس کے ضمن میں آہی جاتی۔ سنت کو علاحدہ اہتمام سے ذکر کرنا اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی مستقل حیثیت ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول دونوں کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ ۔(۶۴)

کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اگر یہ منہ پھیریں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ ۔(۶۵)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۔(۶۶)

اطاعت کرو۔ اگر تم لوگوں نے رخ موڑا تو رسول کے ذمہ وہی ہے جو ان پر لازم کیا گیا ہے (یعنی تبلیغ) اور تم پر وہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا ہے (دعوت قبول کرنا) اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو ہدایت پاؤ گے۔

مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۶۷)

جو رسول دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

ان آیات میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسالت سے مراد کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی ہے جس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جس سے روگردانی کرنے پر کفر کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ احادیث میں تو صراحت کے ساتھ اس کو قرآن کے مثل کہا گیا ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے خیبر میں ارشاد فرمایا:

أيحسب أحدكم متكئا على أريكته قد يظن أن الله لم يحرم شيئاً إلا ما في هذا القرآن ألا و إني و الله قد وعظت و أمرت و نهيت عن أشياء إنها لمثل القرآن أو أكثر (۶۸)

کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے ہوئے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان ہی چیزوں کو حرام کیا ہے جو قرآن میں ہیں؟ سن لو، خدا کی قسم! میں نے بھی نصیحتیں کی ہیں، احکام دیے ہیں، چیزوں سے منع کیا ہے وہ بھی قرآن کے مثل ہیں یا اس سے زیادہ ہیں۔

حضرت مقدام بن معدیکربؓ حضرت رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ألا إني أوتيت الكتاب و مثله معه ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول: عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه وما

سن لو، مجھے کتاب اللہ اور اس کے ساتھ اس کے مثل چیز دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے تخت پر کوئی آسودہ حال شخص یہ کہتا ہو کہ تم اس قرآن کو اختیار کرو، اس میں جو حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو

وجدتم فيه من حرام فحرموه، ألا لا يحل لكم لحم الحمار الأهلي ولا كل ذي ناب من السباع (٦٩)

اس میں جو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو، سن لو، پالتو گدھے کا گوشت تمہارے لیے حلال نہیں ہے اور نہ داڑھ والے درندے حلال ہیں۔

حضرت ابورافعؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه فيقول لاندري ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه (۷۰)

میں تم میں سے کسی کو تخت پر ٹیک لگائے ہوئے اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کے پاس میرے احکام میں سے کوئی حکم پہنچا ہو جس کو کرنے کا میں نے حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو تو وہ یہ کہے کہ اس کو ہم نہیں جانتے۔ کتاب اللہ میں جو ہم نے پایا اس کی اتباع کی۔

حضرت ابورافعؓ کی اس حدیث کو پیش کرکے امام بغوی فرماتے ہیں:

وفي الحديث دليل على أنه لا حاجة بالحديث إلى أن يعرض على ا لكتاب وأنه مهما ثبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان حجة بنفسه، وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم : ألا إني أوتيت الكتاب ومثله معه۔ (۷۱)

حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ حدیث کو کتاب اللہ پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو حدیث بھی رسول اللہؐ سے ثابت ہوگی تو وہ بذات خود حجت ہوگی۔ حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ سن لو، مجھے کتاب اللہ اور اس کے ساتھ اس کے مثل چیز دی گئی ہے۔

امام خطابی حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قوله: "أوتيت الكتاب ومثله معه" يحتمل وجهين من التأويل: أحدهما أن يكون معناه أنه أوتي من الوحي الباطن غير المتلو مثل ما أوتي من

آپؐ کا قول "مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس کے مثل چیز دی گئی ہے۔" اس کی دو توجیہ ہو سکتی ہیں۔ (۱) اس کا معنی یہ ہوگا کہ وحی ظاہر متلو (قرآن) کے مثل وحی باطن غیر متلو (سنت)

الظاهر المتلو۔ ويحتمل أن يكون معناه أنه أوتي الكتاب وحياً يتلي و أوتي من البيان أي أذن له أن يبين ما في الكتاب و يعم و يخص و أن يزيد عليه فيشرع ماليس في الكتاب ذكر فيكون ذلک في وجوب الحكم ولزوم العمل به كالظاهر المتلو من القرآن۔ (۷۲)

بھی آپؐ کو دی گئی۔ (۲) اس کا بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ آپؐ کو کتاب عطا کی گئی جو وحی ہے اس کی تلاوت کی جاتی ہے اور بیان بھی عطا کیا گیا ہے یعنی آپؐ کو اجازت دی گئی ہے کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس کی آپ وضاحت فرمادیں۔ تعمیم و تخصیص کریں اور اس پر اضافہ کریں۔ ایسی چیز مشروع کریں جس کا کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ یہ وجوب حکم میں اور اس پر عمل لازم ہونے میں ظاہر متلو یعنی قرآن کی طرح ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں:

وقول رسول الله صلى الله عليه وسلم حجة لدلالة المعجزة على صدقه و لأمر الله تعالٰى إيانا باتباعه و لأنه لاينطق عن الهوى إن هو إلا وحي يوحي (النجم) لكن بعض الوحي يتلي فيسمى كتاباً و بعضه لا يتلي وهو السنة۔ (۷۳)

حضرت رسول اللہؐ کا قول حجت ہے، کیونکہ اس کی صداقت پر معجزہ کی دلیل موجود ہے اور اس وجہ سے کہ اللہ تعالٰی نے اس کی اتباع کا ہمیں حکم دیا ہے۔ اور اس وجہ سے کہ ’’آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ یہ وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔‘‘ (سورہ نجم) لیکن بعض وحی کی تلاوت ہوتی ہے جو کتاب (قرآن) کے نام سے موسوم ہے اور بعض کی تلاوت نہیں ہوتی وہ سنت ہے۔

علامہ بدرالدین زرکشی لکھتے ہیں:

مسئلہ: سنت احکام کی تشریع میں مستقل ہے...... امام شافعی نے الرسالہ میں صراحت کی ہے کہ سنت قرآن کی طرح نازل ہوئی ہے۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ {وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى

فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الۡحِکۡمَۃِ} (احزاب:۳۴) اللہ تعالیٰ نے قرآن کی طرح تلاوت کے لفظ سے سنت (حکمت) کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے کتاب اللہ کے ساتھ غیر کتاب بھی دی ہے یعنی وہ سنت جو آپؐ کی زبان مبارک سے ظاہر ہوئی ہے جس (کے احکام) کو قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اسی لیے حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ سن لو، مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس کی مثل چیز دی گئی ہے۔ (ابوداؤد)۔ حافظ دارمی کہتے ہیں کہ آپ کا ارشاد ہے۔ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے مثل سنت دی گئی ہے جس (کے احکام) کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کی تفسیر کرتی ہے۔ جیسے پالتو گدھوں کے گوشت اور ہر داڑھ والے درندے کی تحریم۔ ان دونوں کی کتاب اللہ میں صراحت نہیں ہے۔ (۷۴)

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| اعلم أنه قد اتفق من يعتد به من أهل العلم على أن السنة المطهرة مستقلة بتشريع الاحكام وأنها كالقرآن في تحليل الحلال و تحريم الحرام وقد ثبت عنه صلى الله عليه وسلم أنه قال : ألا إني أوتيت القرآن و مثله معه أي أوتيت القرآن و أوتيت مثله من السنة التي لم ينطق بها القرآن، وذلک كتحريم لحوم الحمر الأهلية و تحريم كل ذي ناب من السباع و مخلب من الطيور وغير ذلک مما لا يأتي عليه الحصر و الحاصل أن ثبوت حجية السنة المطهرة | جان لو کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ احکام کی تشریع میں سنت مطہرہ مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ حلال کی تحلیل اور حرام کی تحریم میں یہ قرآن کی طرح (مستقل اصل) ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''سن لو، مجھے قرآن اور اس کے مثل دیا گیا ہے''۔ یعنی قرآن اور اس کے مثل وہ سنت دی گئی ہے جس کو قرآن نے بیان نہیں کیا ہے۔ جیسے پالتو گدھوں کی تحریم اور داڑھ والے درندوں اور چنگل والے پرندوں کی تحریم وغیرہ احکام جو بے شمار ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سنت مطہرہ کے حجت ہونے کا ثبوت اور احکام کی تشریع میں اس کا مستقل ہونا دین کی ضروریات میں سے ہے، |

| | |
|---|---|
| واستقلالها بتشريع الاحكام ضرورة دينية ولا يخالف في ذلك إلا من لا حظ له في دين الإسلام۔ (۷۵) | اس کی وہی مخالفت کرے گا جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ |

آیات قرآنی، احادیث نبوی اور فقہائے اسلام کے اقوال سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تشریع میں سنت کی مستقل حیثیت ہے۔اس کو قرآن پر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔اگر سنت سے کوئی حکم ثابت ہورہا ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔وہ بذات خود حجت ہے۔

**مفسرین پر بے اعتمادی اور اپنے فہم ناقص پر مکمل اعتماد:** مضمون نگار نے ایک جگہ نظم قرآنی میں اپنی مہارت اور روح قرآنی سے واقفیت کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں مفسرین کا اندھا مقلد لکھا ہے۔خیر ہم تو حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔اس لیے تقلید بھی کرتے ہیں۔مگر یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے کہ خود کو عقل کل سمجھ کر علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین کسی پر اعتماد نہ کیا جائے، سب کے بارے میں یہ طے کرلیا جائے کہ سب سے چوک ہوگئی ہے، یہاں تک کہ اپنے فہم ناقص کے مقابلہ میں صحابہ کرامؓ کے اقوال کو بھی اہمیت نہ دی جائے، سنت نبوی کی من مانی تاویل شروع کردی جائے۔ پوری امت ایک طرف ہو اور فہم ناقص ایک طرف ہو، یعنی پوری امت سے تو غلطی ہوسکتی ہے مگر فہم ناقص تمام غلطیوں سے مبرا اور معصوم ہے۔یہ ایسی چیز ہے جس سے انسان گمراہی کی طرف چلا جاتا ہے۔خود کو عقل کل سمجھ کر جمہور امت سے اختلاف کا رویہ انسان کو تباہی تک پہنچادیتا ہے۔اس مسئلے کو ہم چند احادیث سے واضح کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| لا يجمع الله أمتي على ضلالة أبداً و يدالله على الجماعة هكذا فاتبعوا السواد الأعظم فإنه من شذ شذ في النار۔ (۷۶) | اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔اس طرح جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔سواد اعظم کی اتباع کرو۔ کیونکہ جو اس سے علاحدہ ہوجائے گا وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ |

حضرت اسامہ بن شریکؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| يد الله على الجماعة فإذا شذ الشاذ منهم اختطفه الشيطان كما يختطف الذئب الشاذ من الغنم۔ (۷۷) | جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جب اس سے کوئی علاحدہ ہوجاتا ہے تو اس کو شیطان اچک لیتا ہے جیسے ریوڑ میں سے کوئی بکری جب علاحدہ ہوتی ہے تو اس کو بھیڑیا اچک لیتا ہے۔ |

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| إن امتی لا تجتمع على ضلالة فإذا رأيتم اختلافاً فعليكم بالسواد الاعظم۔ (۷۸) | میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی جب تم اختلاف پاؤ تو سواد اعظم کو اختیار کرو۔ |

ان احادیث سے معلوم ہوجاتا ہے کہ امت مسلمہ کی بہت بڑی جماعت جس طرف گئی ہو اور اس نے جس قول کو اختیار کیا ہو اس سے انحراف کرنے اور اس سے علاحدہ قول اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے جمہور امت کے مسلک کو چھوڑ کر خود رائی کی بناء پر سب سے جداگانہ قول کو لینا شدید ناپسندیدہ ہے اور یہ گمراہی کی طرف جانے کا سبب ہے۔ اسی کو حدیث میں **شذ فی النار** سے یا **اختطفه الشيطان** سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک نصیحت یاد آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ”تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں، اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹئے گا۔ اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں، جمہور کے مسلک سے نہ ہٹئے، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے اس کے شواہد و قرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں“۔ (۷۹)

**پہلی حدیث:** پہلی حدیث میں صراحت ہے کہ قاتل عمد کو آپؐ کے اشارے پر ولی مقتول نے معاف کردیا تھا۔ لیکن موصوف نے اس میں فاسد تاویلات کی بھرمار کردی۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وہ لکھتے ہیں:

''حدیث کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ واقعہ قتل کسی منصوبہ بندی کے بغیر اچانک پیش آیا۔ قاتل اپنے ساتھی کی دشنام طرازی سے اس قدر مشتعل ہو گیا کہ اس نے اس کے سر پر کلہاڑی ماردی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ نبیؐ نے قصاص کے بجائے دیت کا فیصلہ فرمایا۔ لیکن قاتل اپنی انتہائی غربت کی وجہ سے دیت ادا کرنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ آپؐ نے ولی مقتول کے حوالہ کر دیا شاید وہ اس کی غربت پر ترس کھا کر اسے چھوڑ دے۔ لیکن جب وہ اسے قتل کے ارادے سے لے چلا تو آپؐ نے اس کی سنگدلی پر ناگواری کا اظہار فرمایا۔ اسے جوں ہی آپؐ کی ناگواری کا علم ہوا اس نے قاتل کو چھوڑ دیا یعنی اس سے قصاص نہیں لیا''۔ (معارف دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۴۱۷)

موصوف کی یہ پوری بحث فاسد تاویلات اور مغالطہ انگیزی سے بھری ہے۔ ذیل میں اس کی کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔

۱۔ یہ کہنا کہ قتل منصوبہ بندی کے بغیر ہوا اس لیے دیت کا فیصلہ کیا گیا۔ یعنی اس کو قتل خطا قرار دے رہے ہیں۔ یہ تاویل فاسد ہے۔ فقہائے اسلام میں سے کسی فقیہ نے یہ نہیں کہا ہے کہ منصوبہ بندی سے جو قتل ہو وہی قتل عمد ہے اور جو قتل منصوبہ بندی کے بغیر ہو وہ قتل عمد نہیں ہے۔ یہ موصوف کی خود ساختہ رائے ہے جو جمہور امت کے خلاف ہے۔ اس واقعہ میں قتل منصوبہ بندی سے ہوا ہو یا غیر منصوبہ بندی سے وہ مارنے کے ارادے سے ہوا ہے اور کلہاڑی سے ہوا ہے اس لیے وہ قتل عمد ہی ہے۔ جس میں موصوف کے نزدیک معافی قرآن کے خلاف ہے۔

۲۔ اگر قاتل غریب ہو تو کیا اس کو معافی ہو جائے گی؟ اور اگر قاتل امیر ہو تو اس کو معافی نہیں ہوگی؟ یہ فرق آپ نے کہاں سے نکالا؟ اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ بھی جمہور امت کے خلاف ہے۔

۳۔ یہ کہنا کہ قاتل کو ولی مقتول کے حوالہ اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ اس کی غربت پر ترس کھا کر چھوڑ دے۔ یہ فاسد تاویل ہے۔ کیونکہ جب معاملہ دیت پر طے نہیں ہوا اور ولی مقتول معاف کرنے

پر تیار نہیں تھا تو قاتل کو قصاص کے لیے ولی مقتول کے حوالہ کیا گیا تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم ہی میں یہ واقعہ دوسری سند سے اس طرح مروی ہے۔

أتي رسول الله صلى الله عليه وسلم برجل قتل رجلاً فأقاد ولي المقتول منه فانطلق به وفي عنقه نسعة يجرها فلما أدبر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : القاتل و المقتول في النار ۔ فأتى رجل الرجل فقال له مقالة رسول الله صلى الله عليه وسلم فخلى عنه۔ قال اسماعيل بن سالم ذكر ذلک لحبيب بن ثابت فقال حدثني ابن اشوع أن النبي صلى الله عليه وسلم إنما سأله أن يعفو عنه فأبى۔ (۸۰)

رسول اللہؐ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے کسی شخص کو قتل کر دیا تھا۔ تو آپ نے قصاص کے لیے اسے ولی مقتول کے حوالہ کر دیا، وہ اسے لے کر چلا، قاتل کی گردن میں چمڑے کی ڈوری تھی جس کو وہ کھینچ رہا تھا، جب اس نے رخ موڑا تو آپ نے فرمایا کہ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔ ایک شخص نے ولی کو فرمان نبویؐ کی خبر دی تو اس نے قاتل کو چھوڑ دیا۔ اسماعیل بن سالم کہتے ہیں کہ حبیب بن ثابت کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ مجھ سے ابن اشوع نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ نے (پہلے) اس سے معاف کرنے کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

اس میں الفاظ حدیث ”أقاد ولي المقتول منه“ (ولی مقتول کو اس سے قصاص لینے پر قادر بنا دیا) سے وضاحت ہوجاتی ہے کہ قصاص کے لیے دیا تھا۔ اس کی غربت پر ترس کھا کر چھوڑنے کے لیے نہیں دیا تھا۔ مسلم میں اس حدیث کے باب کے عنوان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ باب صحة الاقرار بالقتل وتمكين ولي القتيل من القصاص و استحباب طلب العفو منه۔

یعنی قتل کے اقرار کا صحیح ہونا، مقتول کے ولی کو قصاص پر قادر بنانا اور اس سے معافی کی طلب کا مستحب ہونا۔

اسی طرح امام ابوالعباس قرطبی شرح مسلم میں ’’دونک صاحبک‘‘ کی تشریح کرتے ہیں۔

أي خذه فاصنع به ما شئت۔ (۸۱)　　یعنی لے جاؤ اس کے ساتھ جو چاہو کرو۔

بتائیں کہ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ کیا قاتل کو ولی مقتول کے حوالہ اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ اس کی غربت پر ترس کھا کر چھوڑ دے یا اس لیے کہ ولی اس سے قصاص لے لے۔ ظاہر ہے کہ ''اس کے ساتھ جو چاہو کرو'' یہ قصاص کی اجازت ہوئی۔ لیکن موصوف نے اس کی معنوی تحریف کر کے اس کو خود ساختہ مطلب پہنا دیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ قتل عمد ہے۔ اس میں عدالت کو صرف قصاص لینے کا اختیار ہوتا ہے۔ البتہ ولی مقتول کو قصاص، دیت اور معافی ان تینوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق رہتا ہے۔ یہاں حضرت رسول اللہؐ نے بحیثیت قاضی پہلے تو ولی مقتول سے معافی یا قاتل سے دیت کی بات کی۔ جب اس پر معاملہ طے نہیں ہوا تو آپ نے قاتل کو قصاص کے لیے ولی مقتول کے حوالہ کر دیا۔ لیکن آپ کی خواہش تھی کہ معاملہ دیت یا معافی پر حل ہو جائے۔ اس لیے آپ نے ایسا جملہ استعمال فرمایا جس سے ولی مقتول نے قاتل کو معاف کر دیا۔

الغرض موصوف کی فاسد تاویلات کے باوجود اس حدیث سے صراحت کے ساتھ قتل عمد میں معافی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی جمہور امت کا مسلک بھی ہے۔

دوسری حدیث:　اس حدیث میں بھی قتل عمد میں معافی کی صراحت ملتی ہے۔ لیکن موصوف نے ایک اور حدیث نقل کی ہے۔ اس میں بھی معافی کی صراحت موجود ہے۔ ملاحظہ کریں:

| | |
|---|---|
| فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم: اعف عنه، فأبی، فقال خذ الدیة فأبی فقال اذهب فاقتله فإنک مثله، فخلی سبیله۔ (۸۲) | حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو معاف کر دو، تو اس نے انکار کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ دیت لے لو، تو اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اس کو قتل کر دو، تم اسی کے مثل ہو۔ تو اس نے قاتل کو چھوڑ دیا۔ |

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھیں تو واقعے کی صحیح صورت یہ بنتی ہے کہ جب قاتل نے نبی کے سامنے بیان حلفی دیا ہوگا کہ اس نے بالارادہ قتل نہیں کیا ہے تو آپ

نے ولی مقتول سے فرمایا ہوگا کہ جیسا کہ پہلی حدیث میں ہے کہ دیت لے لو اسے قتل نہ کرو، جب ولی مقتول نے قصاص لینے پر اصرار کیا ہوگا تو آپ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہوگا۔ لیکن ان لفظوں میں نہیں جو روایت میں منقول ہیں۔ آپ کی ناگواری دیکھ کر ولی مقتول نے قاتل کو چھوڑ دیا ہوگا۔'' (معارف دسمبر ۱۳ء ص ۴۱۹)

یہ پوری تفصیل موصوف کے ذہن کی پیداوار ہے کہ ایسا ہوا ہوگا، ویسا ہوا ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قتل منصوبہ بندی کے بغیر ہوا ہے اس لیے قتل عمد نہیں ہے۔ میں اپنے مضمون میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ قاتل کا محض یہ کہنا کہ میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا یہ قتل خطا ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایسا تو ہر قاتل کہہ سکتا ہے۔

| | |
|---|---|
| لا یقبل قول القاتل لم أقصد قتلہ۔ (۸۳) | قاتل کا یہ کہنا کہ میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ |

یہ بھی دیکھیں کہ اگر آپؐ اس کو قتل عمد نہیں مانتے تو ولی مقتول سے **اذھب فاقتلہ** (جاؤ اس کو قتل کردو) کیوں فرماتے؟ کیا قتل خطا میں قصاص لیا جاتا ہے۔ حدیث کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ قتل عمد ہے اور اس کے باوجود حضرت رسول اللہؐ کی خواہش تھی کہ دیت یا معافی پر معاملہ ہو جائے اور آپؐ کے اشارے پر ہی ولی مقتول نے قاتل کو معاف کیا ہے۔ یہ حدیث بھی قتل عمد میں معافی کے درست ہونے پر بالکل صریح ہے۔

**تیسری حدیث:** حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت رسول اللہؐ کے پاس جب بھی قصاص کا کوئی مقدمہ آتا تو آپؐ اس میں معاف کرنے کا حکم دیتے۔ (۸۴)

اس حدیث سے قتل عمد میں معافی کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت رسول اللہؐ کے پاس قصاص کا جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا تو آپؐ معافی کی کوشش کرتے، اگر ولی مقتول راضی نہ ہوتا تو قصاص لیا جاتا جیسا کہ بعض موقع پر قصاص لیے جانے کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔

موصوف کو اس کی کوئی فاسد تاویل بھی نہیں مل پائی اس لیے انہوں نے اس کو ایک دوسری حدیث کے معارض قرار دے کر رد کر دیا۔ لکھتے ہیں:

''یہ حدیث اس روایت کے یکسر خلاف ہے جو صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہؓ

سے مروی ہے۔اب موصوف فرمائیں کہ دونوں میں سے کون سی حدیث صحیح ہے؟ یقیناً صحاح ستہ میں مروی حدیث صحیح ہے کہ یہ نص قرآن کے مطابق ہے"۔(معارف دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۴۲۰)

پہلی بات یہ کہ صحاح ستہ میں مروی حدیث اس حدیث کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ اس کی وضاحت آرہی ہے۔دوسری بات یہ کہ سند کے اعتبار سے دونوں احادیث صحیح ہیں۔اگر وہ حدیث صحاح ستہ میں ہے تو یہ صحاح ستہ میں سے ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ میں ہے۔ان کے علاوہ مزید چار کتابوں میں مجھے ملی ہے۔اس لیے حدیث کے صحیح ہوتے ہوئے اس کو دوسری حدیث کے معارض قرار دے کر رد کردینا اصول ترجیح کے خلاف ہے۔دونوں حدیث صحیح ہیں، دونوں میں تطبیق دی جائے گی۔

**چوتھی حدیث:** عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

"قتل عمد میں قصاص ہے سوا اس کے مقتول کا ولی معاف کردے"۔(۸۵)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس حدیث سے قتل عمد میں معافی کا حکم پوری صراحت سے ثابت ہوجاتا ہے۔مگر موصوف اس صریح حدیث کی کوئی فاسد تاویل نہیں کرسکے تو انہوں نے اس کو بھی دوسری حدیث کے معارض قرار دے کر رد کردیا۔لکھتے ہیں:

"یہ روایت حدیث کی دوسری اہم کتابوں میں منقول نہیں ہے۔

مضمون بھی صحاح ستہ میں مروی اس روایت کے خلاف ہے"۔

کیا اہم کتابوں میں منقول نہ ہونے کی وجہ سے حدیث قابل احتجاج نہیں رہتی؟ اس کا مضمون صحاح ستہ کی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ہاں البتہ فہم ناقص کے خلاف ہے۔

**پانچویں حدیث:** چونکہ میرا گزشتہ مضمون جن صاحب کے جواب میں تھا وہ قتل عمد میں صرف قصاص کے قائل تھے اور دیت و معافی دونوں کا انکار کررہے تھے۔اس لیے ان کے جواب میں یہ حدیث پیش کی گئی تھی۔وہ حدیث یہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے فتح مکہ کے موقع پر خطبہ نبویؐ کی ایک طویل حدیث مروی ہے اس میں یہ بھی ہے۔جس شخص کا کوئی (ولی) قتل کردیا جائے تو اس کو دو میں سے ایک چیز کا اختیار ہوگا یا تو

فدیہ (دیت) لے یا قصاص لے۔(۸۶)

اس سے یہ استدلال تھا کہ قتل عمد میں دیت بھی ہے جس کا وہ صاحب انکار کررہے تھے۔ اب اس پر توجہ دیے بغیر مضمون نگار صاحب لکھتے ہیں:

> ''حیرت ہے کہ جناب بدر احمد مجیبی صاحب نے اس حصۂ حدیث کو کیوں نقل کیا جس سے اس کے نقطۂ نظر کی واضح تردید ہوتی ہے کہ قتل عمد میں قصاص اور دیت کے علاوہ معافی بھی ہے''۔(معارف دسمبر ۱۳ء ص ۴۲۰)

ان کی یہ حیرت بے محل ہے کیونکہ یہ جن صاحب کے مضمون کا جواب ہے وہ قتل عمد میں دیت کے منکر تھے اور اس حدیث میں قتل عمد میں دیت کی صراحت ہے۔مزید یہ کہ یہ حدیث قتل عمد میں معافی کے خلاف نہیں ہے۔اس کو معافی کے خلاف سمجھنا ان کا فہم ناقص ہے جو پوری امت کے نقطۂ نظر کے بالکل برعکس ہے۔ہم ذیل میں اس کی تفصیل کرتے ہیں۔

اوپر ہم تفصیل سے قرآن وحدیث سے اس بات کو واضح کرچکے ہیں کہ شریعت نے جہاں بھی ظلم کے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے وہاں ظالم کو معاف کرنے کی بھی پوری اجازت دی ہے۔ معاف کرنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک زیادہ پسندیدہ عمل ہے اور اس پر اجرو ثواب بھی ہے۔اس لیے کسی کو معاف کرنے کے لیے علاحدہ سے صریح حکم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں ظلم کی سزا کے لیے حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لیے اس حدیث میں مقتول کے ولی کو مقتول کو سزا دینے میں دو چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ دیت لینے پر راضی ہوجائے یا پھر قصاص لے۔یہ سزا دینے میں اختیار ہے۔کسی کو معاف کرنے کے لیے کسی اختیار کی ضرورت نہیں ہوتی۔اس کا اختیار ہر آدمی کو حاصل رہتا ہے۔اس لیے اس حدیث سے معافی کی نفی پر استدلال کرنا عدم تدبر کی دلیل ہے۔اگر حدیث میں اس کی صراحت ہوتی کہ معاف کرنے کا حق نہیں ہوگا۔صرف دیت اور قصاص کا اختیار ہوگا تو اس سے وہ استدلال کرسکتے تھے۔مگر حدیث میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے۔اس لیے دیت وقصاص کے ساتھ معافی بھی شامل ہے۔احادیث میں صراحت موجود ہے خود حضرت رسول اللہؐ نے قتل عمد میں ولی مقتول کو معافی کی ترغیب دی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی نص میں کچھ چیزوں کا ذکر ہو اور دوسری نص میں اس پر اضافہ ہو تو کیا یہ کہا جائے گا کہ دونوں نص میں تعارض ہے۔ اس لیے فلاں نص کو رد کر دیا جائے۔ یا دونوں میں مطابقت پیدا کر کے دونوں پر عمل کیا جائے گا۔ عمل کی صورت یہی ہوگی کہ اضافہ کو شامل کر کے حکم لگایا جائے گا۔ ہم اس کی مثال دیتے ہیں۔ سورہ انعام میں ہے:

۱۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۸۷)

کہہ دیجیے کہ میرے پاس جو احکام بذریعہ وحی آئے ہیں ان میں کسی کھانے والے کے لیے جو وہ کھاتا ہے کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ ناپاک ہے یا گناہ کی چیز ہو جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔

سورہ نحل میں ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۸۸)

تم پر صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ (جانور) حرام ہیں جن پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔

ان دونوں آیات میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مردار، خون، خنزیر کا گوشت، غیر اللہ کے نام پر نامزد کیے ہوئے جانور۔ اس کو حصر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ دوسری کوئی چیز حرام نہیں ہوگی۔ لیکن دوسری نصوص میں دوسری چیزوں کو بھی حرام بتایا گیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۸۹)

تم لوگوں پر حرام کیے گئے ہیں مردار، خون، خنزیر کا گوشت، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو کسی چوٹ سے مرا ہو، جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو، جو سینگ مارنے سے مرا ہو، جس کی درندے کے پھاڑ کھانے سے موت ہوئی ہو سوا اس کے کہ تم اس کو ذبح کر لو اور

جس کو استھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔

اس آیت میں ان چار محرمات پر چھ چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حدیث نبوی میں پالتو گدھے، ذی ناب درندے، چنگل والے پرندوں کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ احادیث اسی مضمون میں موجود ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورہ مائدہ میں مذکور پانچ چیزیں مردار میں شامل ہیں اور استھانوں کا ذبیحہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہے۔ لیکن حدیث میں جن چیزوں کا ذکر ہے ان کا اضافہ تو پوری امت مانتی ہے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورہ انعام اور سورہ نحل کی آیات میں جن چیزوں کو حرام بتایا گیا ہے اور حصر کے ساتھ ان ہی کو حرام بتایا گیا ہے بس وہی حرام ہیں۔ سورہ مائدہ کی آیت اور حدیث نبوی اس کے معارض ہیں اس لیے ان چیزوں کی حرمت نہیں ہوگی۔ اس لیے گدھے اور بقیہ چیزیں حلال ہیں۔ کیا کوئی ایسا کہہ سکتا ہے؟

۲۔ وضو میں قدموں کا دھونا فرض ہے۔ یہ قرآن سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

| | |
|---|---|
| يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (۹۰) | اے ایمان والو! جب تم نماز کی طرف جاؤ تو اپنے چہروں اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرلو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں کو دھولو۔ |

اس آیت میں کوئی تفصیل نہیں ہے۔ اس لیے پیروں میں خف ہوں یا پیر خالی ہوں دونوں صورتوں میں دھونے کا حکم ہوگا۔ مگر حدیث نبوی سے معلوم ہوا کہ جب پیروں پر خف پہنے ہوں تو ان کو دھونا ضروری نہیں ہے۔ اس پر مسح کر سکتے ہیں۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت رسول اللہؐ کے بارے میں روایت کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| فتوضأ وضوءه للصلاة ثم مسح علی خفیه ثم صلی۔ (۹۱) | آپ نے نماز کے لیے وضو کی طرح وضو فرمایا پھر اپنے دونوں خف پر مسح فرمایا پھر نماز ادا فرمائی۔ |

کیا یہ کہا جائے گا کہ خف پر مسح نص قرآنی کے خلاف ہے۔ اس لیے اس پر اس پر عمل نہیں کیا جائے گا اور خف پر مسح کرنا جائز نہیں ہے؟

۳۔قرآن سے زنا کی سزا کوڑے لگانا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۹۲) | زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔ |

اس آیت میں محصن اور غیر محصن کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔سب کے لیے یہ حکم عام ہے۔ مگر حدیث سے غیر محصن کے لیے کوڑے کی سزا اور محصن کے لیے رجم کی سزا ثابت ہے۔کیا یہ کہا جائے گا کہ رجم کی سزا قرآنی حکم کے خلاف ہے اس لیے اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے؟

۴۔قرآن میں رضاعت سے صرف دو رشتوں کی حرمت بیان کی گئی ہے۔وہ رشتے رضاعی ماں اور رضاعی بہن کے ہیں۔محرمات کے بیان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

| | |
|---|---|
| وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (۹۳) | اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں۔ |

محرمات کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (۹۴) | ان کے علاوہ سب (عورتیں) تمہارے لیے حلال ہیں۔ |

اس سے مذکورہ محرمات کے علاوہ تمام عورتوں کی اباحت ثابت ہوتی ہے۔مگر حدیث میں ہے۔

| | |
|---|---|
| يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب (۹۵) | رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہیں۔ |

اس حدیث سے رضاعت سے مزید رشتوں کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث قرآنی حکم کے خلاف ہے اس لیے اس پر عمل جائز نہیں ہے؟

۵۔قرآن سے دو عورتوں کو ایک نکاح میں جمع کی صورت میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنے کی ممانعت ثابت ہے۔محرمات کے بیان میں ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (۹۶) | اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو۔ |

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو عورتوں کو ایک نکاح میں جمع کی صورت میں صرف ایک ہی صورت حرام ہے،وہ دو بہنوں کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا ہے۔لیکن حدیث میں اس پر اضافہ

ہے۔ پھوپھی اور بھتیجی کو اسی طرح خالہ اور بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تنكح المرأة على عمتها أو خالتها۔ (۷۹) | حضرت رسول اللہؐ نے اس سے منع فرمایا کہ کسی عورت سے اس کی پھوپھی کی موجودگی میں یا اس کی خالہ کی موجودگی میں نکاح کیا جائے۔ |

نص قرآنی کے حکم میں یہ جو اضافہ ہوا ہے کیا اس کے بارے میں کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ نص کے خلاف ہے۔ قرآن میں صرف جمع بین الاختین کو حرام کہا گیا ہے۔ پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کے جمع کی ممانعت نص قرآنی کے معارض ہے اس لیے اس کو رد کر دیا جائے گا؟

جب ان تمام صورتوں میں پوری امت کے نزدیک ایک نص کے حکم میں دوسری نص سے اضافہ کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کو شامل کر کے حکم لگایا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن میں سورہ بقرہ (۱۷۸) میں جو قتل عمد میں دیت اور قصاص کا ذکر کیا گیا ہے اس پر دوسری نصوص سے اضافہ نہیں کیا جائے گا بلکہ دوسری تمام نصوص کو اس کے معارض قرار دے کر رد کر دیا جائے گا۔ اسی طرح حدیث صحاح ستہ میں جو دیت اور قصاص کا ذکر ہے اس پر دوسری نصوص سے اضافہ نہیں کیا جائے گا اور تمام نصوص کو اس کے خلاف بتا کر رد کر دیا جائے گا؟

یہ اہل علم کا طریقہ نہیں ہے، یہ ان لوگوں کا طریقہ ہو سکتا ہے جو اپنی عقل کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس کے سامنے تمام نصوص کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور قرآن و حدیث کے احکام کو بازیچۂ اطفال بنا دیتے ہیں۔

**چھٹی حدیث:** سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ کتب حدیث میں حضرت ابوشریح خزاعیؓ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص قتل یا جراحت کے معاملہ میں مبتلا ہو (یعنی ولی مقتول یا خود مجروح شخص) اس کو تین چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا۔ اگر وہ (ان تین کے علاوہ) چوتھا کام کرنا چاہے تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لو۔ (تین چیزیں یہ ہیں) کہ وہ قتل کرے (قصاص لے) یا معاف کر دے یا دیت لے لے۔ جس نے ان میں سے کوئی کام کیا پھر لوٹ گیا (یعنی دیت لینے یا معاف کرنے

کے بعد پھر قتل کردیا) تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ برابر رہے گا''۔(۹۸)

یہ حدیث قتل عمد میں ولی مقتول کے لیے قصاص، دیت اور معافی تینوں اختیارات ہونے کے بارے میں صریح ہے۔ اس میں کسی فاسد تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موصوف اپنے نقطہ نظر سے اس کی کوئی تاویل نہیں کرسکے تو حکم صادر کردیا کہ یہ حدیث صحاح ستہ والی حدیث کے خلاف ہے۔ کہتے ہیں:

''ابوشریح خزاعیؓ سے مروی یہ حدیث نفس مضمون کے اعتبار سے صحاح ستہ کی اس حدیث کے خلاف ہے۔ جس کا ذکر پانچویں حدیث کے ذیل میں ہوچکا ہے۔ اس روایت کے مطابق قتل عمد میں قصاص اور دیت ہے۔ لیکن اِس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ قصاص، دیت اور معافی۔ اس تعارض کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس روایت میں سقم ہے اور وہ سقم دم کا لفظ ہے جسے راوی نے دانستہ طور پر بڑھا دیا ہے''۔(معارف دسمبر ۱۳ء ص ۴۲۱)

موصوف کو دونوں احادیث میں جو تعارض نظر آرہا ہے وہ ان کے فہم خاص پر مبنی ہے۔ ان دونوں احادیث میں محدثین کرام اور فقہائے اسلام کو کوئی تعارض نظر نہیں آتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ معاف کرنے کا اختیار ہر شخص کو حاصل ہے۔ ایک حدیث میں اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے اور دوسری حدیث میں اس کی صراحت کردی گئی ہے۔ چنانچہ امام ترمذی دونوں کے حکم میں کوئی تعارض نہیں سمجھتے۔ اپنی کتاب میں ایک ہی باب میں دونوں احادیث کی روایت کرتے ہیں۔ باب کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ **باب ماجاء فی حکم ولی القتیل فی القصاص و العفو** (۹۹) یعنی باب قصاص اور معافی میں ولی مقتول کے حکم کے بارے میں جو وارد ہے اس کے بیان میں۔ (باقی)

---

## حواشی

ماہ جنوری ۲۰۱۶ء کے حاشیے:

(۱) المقدمۃ فی اصول التفسیر لابن تیمیۃ :۲۱۔ (۲) سورہ الحج:۶۰۔ (۳) سورہ النور: ۲۲۔ (۴) سورہ الشوریٰ: ۲۵۔ (۵) سورہ الشوریٰ: ۳۰۔ (۶) سورہ النحل: ۱۲۶۔ (۷) سورہ الاعراف: ۱۹۹۔ (۸) سورہ الحجر: ۸۵۔ (۹) سورہ الشوریٰ: ۴۳۔ (۱۰) سورہ النور: ۲۲۔ (۱۱) سورہ التغابن: ۱۴۔ (۱۲) سورہ آل عمران: ۱۳۴۔ (۱۳) سورہ البقرۃ: ۱۰۹۔ (۱۴) الصحیح للبخاری، قبیل باب الخوارج والملحدین۔ والصحیح للمسلم، باب غزوۃ احد۔ (۱۵) الصحیح للبخاری، باب اذا قال احدکم آمین، والصحیح

للمسلم، باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔(۱۶) الادب المفرد للبخاری۔(۱۷) المسند لاحمد بن حنبل ۲/ ۲۳۵۔(۱۸) السنن للنسائی، باب الامر بالعفوعن القصاص، السنن لابی داؤد، باب الامام یامر بالعفو فی الدم، السنن لابن ماجہ ۲/ ۸۹۸، المسند لاحمد بن حنبل ۳/ ۱۳، السنن الکبری للبیہقی ۸/ ۵۴، المسند لابی یعلی ۴/ ۷، المسند للبزار ۱۳/ ۵۲۱۔(۱۹) السنن لابی داؤد، باب الامام یامر بالعفو فی الدم، السنن الکبری للنسائی ۶/ ۳۲۶، المستخرج لابی عوانۃ ۷/ ۱۸۷، شرح السنۃ للبغوی ۱۰/ ۱۶۰۔(۲۰) نیل الاوطار للشوکانی ۷/ ۱۱۱۔(۲۱) سورہ الاسراء: ۳۳۔(۲۲) التفسیر للامام الطبرانی، سورہ الاسراء۔(۲۳) تفسیر القرآن العزیز لابن ابی زمنین المالکی ۳/ ۲۰۔(۲۴) تفسیر الہدایۃ لابی محمد المکی ۶/ ۴۱۹۲۔(۲۵) الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز للواحدی النیسا پوری ۱/ ۴۴۸۔(۲۶) المحرر الوجیز لابن عطیۃ الاندلسی ۴/ ۲۳۶۔(۲۷) الجواھر الحسان فی تفسیر القرآن للثعالبی ۲/ ۳۷۷۔(۲۸) فتح القدیر للشوکانی ۴/ ۳۰۳۔(۲۹) فتح البیان للقنوجی ۷/ ۳۸۷۔(۳۰) التفسیر الوسیط للزحیلی ۲/ ۱۳۴۶۔(۳۱) ایسر التفاسیر للجزائری ۲/ ۳۴۴۔(۳۲) جامع البیان فی تاویل القرآن للطبری ۱۷/ ۴۴۳۔(۳۳) معالم التنزیل لمحی السنۃ البغوی ۵/ ۹۱۔(۳۴) الکشف والبیان عن تفسیر القرآن للثعلبی ۶/ ۹۸۔(۳۵) تفسیر مفاتح الغیب للرازی ۲۰/ ۳۳۵۔(۳۶) علوم القرآن۔مولانا تقی عثمانی ص ۶۳۔(۳۷) الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۱/ ۳۷۔(۳۸) الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ۱/ ۵۳۔(۳۹) بغوی، طبرانی، ابن جوزی، خازن، پچھلے مضمون میں ان کے حوالے آچکے ہیں۔(۴۰) البدائع للکاسانی وردالمحتار للشامی کتاب الجنایات۔(۴۱) تفسیر اللباب لابن عادل الدمشقی الحنبلی ۱/ ۳۷۴۴۔(۴۲) تفسیر المظھری ۱/ ۳۴۸۸۔(۴۳) تفسیر السراج المنیر ۳/ ۴۳۴۔(۴۴) فتح القدیر للشوکانی ۶/ ۳۸۷۔(۴۵) فتح البیان للقنوجی ۱۲/ ۳۱۲۔(۴۶) الرسالۃ للشافعی: ۸۸۔(۴۷) الرسالۃ للشافعی: ۲۱۲۔(۴۸) الخیر الکثیر للدھلوی: ۸۷۔(۴۹) حجۃ اللہ البالغۃ للدھلوی ۱/ ۴۲۳، ۴۲۴۔(۵۰) الابانۃ الکبری لابن بطۃ العکبری ۱/ ۲۶۵۔(۵۱) جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر ۲/ ۳۶۷۔(۵۲) البحر المحیط للزرکشی ۱/ ۲۳۶۔(۵۳) سورہ الحشر: ۷۔(۵۴) سورہ آل عمران: ۳۱۔(۵۵) سورہ النساء: ۸۰۔(۵۶) ارشاد الفحول للشوکانی ۱/ ۹۷۔(۵۷) الموافقات للشاطبی ۴/ ۱۰

دوسری قسط کے حاشیے:

(۵۸) سورہ النساء: ۱۱۳۔(۵۹) سورہ البقرہ: ۱۵۱۔(۶۰) سورہ البقرہ: ۲۳۱۔(۶۱) سورہ آل عمران: ۱۶۴۔(۶۲) سورہ الجمعۃ: ۲۔(۶۳) سورہ الاحزاب: ۳۴۔(۶۴) سورہ آل عمران: ۳۲۔(۶۵) سورہ محمد: ۳۳۔(۶۶) سورہ النور: ۵۴۔(۶۷) سورہ الحشر: ۷۔(۶۸) السنن لابی داؤد، باب فی تعشیر اھل الذمۃ اذا اختلفوا بالتجارات،

السنن الکبریٰ للبیہقی ۹/ ۲۰۴، السنۃ للمروزی: ۱۱۲۔(۶۹) السنن لابی داؤد، باب فی لزوم السنۃ، الجامع للترمذی، السنن لابن ماجہ، المسند لاحمد ۴/ ۱۳۰، الصحیح لابن حبان ۱/ ۱۸۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ۷/ ۶۷، المستدرک للحاکم ۱/ ۱۹۱، السنۃ للمروزی: ۷۱۔(۷۰) السنن لابی داؤد، باب فی لزوم السنۃ، الجامع للترمذی، السنن لابن ماجہ، السنن الکبریٰ للبیہقی ۷/ ۶۷، المستدرک للحاکم ۱/ ۱۹۰، شرح السنۃ للبغوی ۱/ ۲۰۱۔(۷۱) شرح السنۃ للبغوی ۱/ ۲۰۲۔(۷۲) معالم السنن للخطابی ۴/ ۲۹۸۔(۷۳) المستصفیٰ للغزالی ۱/ ۱۲۸۔(۷۴) البحر المحیط للزرکشی ۳/ ۲۳۶۔(۷۵) ارشاد الفحول للشوکانی ۱/ ۹۷۔ (۷۶) المستدرک للحاکم ۱/ ۲۰۱، الجامع للترمذی، باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ، السنۃ لابن ابی عاصم ۱/ ۳۹۔(۷۷) المعجم الکبیر للطبرانی ۱/ ۲۰۶۔(۷۸) السنن لابن ماجہ، کتاب الفتن ۔(۷۹) خطبات علی میاںؒ ۱/ ۳۴۸۔(۸۰) الصحیح للمسلم، باب القسامۃ، باب صحۃ الاقرار بالقتل۔(۸۱) المفہم شرح تلخیص المسلم للقرطبی ۱۵/ ۱۳۳۔(۸۲) الدیات لابن ابی عاصم ص ۱۰۳۔(۸۳) ردالمختار للشامی، کتاب الجنایات ۔(۸۴) السنن لابی داؤد: کتاب الدیات، باب الامام یامر بالعفو فی الدم، السنن للنسائی: کتاب القسامۃ، باب الامر بالعفو عن القصاص، السنن لابن ماجہ: کتاب الدیات، ۳/ ۶۹۶، السنن الکبریٰ للبیہقی: باب ماجاء فی الترغیب عن العفو فی القصاص، ۸/ ۵۴، المسند لاحمد بن حنبل ۳/ ۲۱۳، المسند لابی یعلی، ۶/ ۳۳۶، المسند للبزار ۲/ ۳۵۲۔(۸۵) السنن للدارقطنی: کتاب الحدود والدیات وغیرھا، المصنف لابن ابی شیبہ: باب من قال العمد قود ۹/ ۳۶۵، احکام القرآن للجصاص الرازی، یہ حدیث المسند لاسحاق بن راھویہ، المعجم للطبرانی میں بھی ہے نصب الرایۃ ۴/ ۳۲۷۔(۸۶) صحاح ستہ ودیگر کتب حدیث ۔ان کا حوالہ گزشتہ مضمون میں آچکا ہے۔(۸۷) سورہ الانعام: ۱۴۵۔(۸۸) سورہ النحل: ۱۱۵۔(۸۹) سورہ المائدۃ: ۳۔(۹۰) سورہ المائدۃ: ۶۔(۹۱) الصحیح للمسلم ۱/ ۱۵۸۔ (۹۲) سورہ النور: ۲۔(۹۳) سورہ النساء: ۲۳۔(۹۴) سورہ النساء: ۲۴۔(۹۵) الصحیح للبخاری ۳/ ۲۲۲۔(۹۶) سورہ النساء: ۲۳۔(۹۷) الصحیح للبخاری، باب لاتنکح امراۃ علی عمتھا ۔(۹۸) السنن لابی داؤد، باب الامام یامر بالعفو بالدم ۴/ ۲۸۷، الجامع للترمذی: کتاب الدیات، باب ماجاء فی حکم ولی القتیل فی القصاص والعفو، السنن لابن ماجہ: باب من قتل لہ قتیل فھو بالخیار بین احدی ثلاث، السنن للدارمی ۲/ ۲۴۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ۸/ ۵۲، المسند لاحمد بن حنبل ۴/ ۳۱، المصنف لابن ابی شیبۃ، ۹/ ۴۴۰، السنن للدارقطنی ۴/ ۸۶، المنتقیٰ لابن الجارود ۱/ ۹۵، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۶/ ۶۲، شرح معانی الآثار للطحاوی ۳/ ۱۷۴، المصنف لعبدالرزاق ۱۰/ ۸۵، التاریخ الکبیر للبخاری ۳/ ۲۲۴، تہذیب الآثار للطبری ۱/ ۳۰، کتاب الدیات لابن ابی عاصم شیبانی ص ۹۹ وغیرہ میں یہ حدیث مختلف سندوں سے مروی ہے۔(۹۹) الجامع للترمذی: کتاب الدیات، باب ماجاء فی حکم ولی القتیل فی القصاص والعفو۔

# سید الشہداء
# اسد اللہ حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب
# پر ایک تحقیقی نظر

ڈاکٹر راہی فدائی

تاریخ اسلام کی معدودے چند ہستیاں ایسی ہیں جن کی سرفروشی و جاں نثاری کے کارنامے صفحات دہر پر زریں و روشن حروف سے رقم تو کیے گئے مگر اس کے باوجود ان بلند حوصلہ و اولوالعزم شخصیات کے مکمل و مستند احوال پردۂ غیب میں پوشیدہ رہ گئے جس کے سبب ان کے اولین تذکرہ نویسوں میں سے بعض کو یہاں وہاں سے رطب و یابس مواد جمع کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، چنانچہ ان تذکرہ نگاروں نے غیر معتبر و نامعقول روایتوں کو بطور زیب داستاں اپنے مقصد و منشا کے مطابق شامل تذکرہ کرلیا اور خوب اس کی تشہیر کردی جس کے نتیجہ میں یہی کتابیں ان کے بعد آنے والے مصنّفین کے لیے مصدر و ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئیں، اسی طرح ان شجیع و جری فرزندان اسلام کے حالات و واقعات مذکورہ تذکروں میں بیان کردہ قصوں کے اسلوب ہی میں زبان زد خاص و عام ہوگئے، اب جبکہ ان مجموعوں کی اشاعت پر صدیاں گزر گئیں، کسی کو اس بات کا خیال نہیں آیا کہ شائع شدہ واقعات کو عقل و خرد کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھے اور ان روایتوں کو نقد و جرح کے جدید اصولوں پر پرکھنے کی سعی کرے۔ تاہم جب کبھی اس امر کی کوشش ہو کہ کتابوں میں تحریر کردہ واقعات کی صحت و عدم صحت آئینہ ہو جائے اور حقیقت حال سامنے آجائے تو ہمیں اس تحقیقی کاوش کی وسعت قلبی کے ساتھ پذیرائی کرنے اور کشادہ ذہنی کے ساتھ ان پر غور و فکر کرنے میں کسی طرح کے تکلف و تردد کو راہ نہیں دینا چاہیے، اسی غرض سے راقم الحروف نے اس مقالے کو اہل نقد و نظر اور اصحاب بصیرت کے

---

نمبر ۲۱/تیسرا کراس، عثمان اسٹریٹ، خوش حال نگر، کے جی ہلی، بنگلور، ۴۵۔

آگے پیش کرنے اوران کی توجہات کو جستجوئے حق کی طرف مبذول کرانے کی جرأت کی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید قوی ہے کہ اس کا خاطر خواہ اور مثبت نتیجہ برآمد ہوگا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

وہ شہدائے کرام جنھوں نے غزوات وجنگی معرکوں میں دشمنان اسلام کا سخت مقابلہ بڑی بے جگری وپامردی کے ساتھ کرتے ہوئے نہ صرف انتہائی دلیری اور کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا بلکہ ان کی صف کی صف الٹ کرانہیں واصل جہنم کردیا اور خود جام شہادت نوش کرکے اپنا نام زندۂ جاوید ہستیوں میں لکھوادیا۔ ان نفوس قدسیہ میں سید الشہدا، اسد اللہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی ذات گرامی بے حد نمایاں اور بہت ممتاز ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک تو آپ کو حضور اکرمؐ سے قرابت قریبہ حاصل ہے کیونکہ آپ حضور پرنورؐ کے علاتی چچا ہونے کے علاوہ حضور اکرمؐ کے رضاعی بھائی بھی ہیں۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت حمزہؓ کے والد جناب عبدالمطلب حضور اکرمؐ کے حقیقی دادا ہیں، دونوں کا سلسلہ نسب یہ ہے، حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب اور محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب۔ مزید براں حضرت حمزہ کی والدہ ہالہ بنت وہب سرکار دوعالمؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب کی چچازاد بہن تھیں۔ اس رشتے سے حضرت حمزہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب جناب عبدالمطلب نے اپنے چہیتے فرزند حضرت عبداللہ جو فاطمہ بنت عمرو بن عائز کے بطن سے تھے، کا عقد نکاح تقریباً سترہ سال کی عمر میں حضرت آمنہ بنت وہب سے کروایا، تو اسی وقت عبدالمطلب نے وہب کے بھائی ذہیب کی دختر ہالہ سے خود شادی کی (۱) جن سے ۵۶۹ء میں حضرت حمزہ پیدا ہوئے۔ اس کے دوسال بعد عبدالمطلب کے پوتے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء مطابق ۱ عام الفیل بروز دوشنبہ بوقت صبح ہوئی۔ (۲)۔ حضرت حمزہ اور حضور اکرمؐ نے ابولہب کی کنیز ثُوَیبہ کا دودھ پیا، ثوبیہ نے آپؐ سے پیشتر حضرت حمزہؓ کو دودھ پلایا تھا، علاوہ ازیں سرور کونینؐ شیرخوارگی کے سلسلہ میں جب حضرت حلیمہ بنت ذویب سعدیہ کے حوالے کیے گئے تو ان ہی دنوں حضرت حمزہؓ بھی بنوسعد کی ایک دایہ کے سپرد تھے۔ اسی خاتون نے ایک روز آپؐ کو بھی اپنا دودھ پلایا تھا، اس طرح حضرت حمزہ اور حضور پُرنورؐ دونوں دوہرے طور پر رضاعی بھائی ہوئے، یہ دوہرا شرف حضرت حمزہؓ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں

ہے۔(۳) حضرت حمزہؓ کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہؐ نے ''سید الشہداء'' اور ''اسد اللہ'' کے معزز ترین القاب سے نوازا ہے، ''مستدرک حاکم'' میں ہے کہ غزوۂ احد میں حضرت حمزہ کی شہادت کے بعد آپؐ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام شہیدوں کے سردار حمزہ ہوں گے (۴) اور ''الاصابہ فی تمییز الصحابہ'' میں مرقوم ہے ''**لقبہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسد اللہ وسماہ سید الشہداء**'' یعنی حضور اکرمؐ نے حضرت حمزہ کو ''اسد اللہ'' کا لقب عطا فرمایا اور آپ کو ''سید الشہداء'' کے نام سے یاد کیا۔(۵) مزید برآں ''معجم الصحابہ'' میں مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ''**والذی نفسی بیدہ انہ مکتوب عند اللہ فی السماء السابعۃ حمزۃ بن عبدالمطلب اسد اللہ واسد رسولہ**'' یعنی قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان پر لکھ دیا ہے کہ حمزہ بن عبدالمطلب اسد اللہ اور اسد الرسول (شیر خدا اور شیر رسول خدا) ہیں۔(٦)

**حضرت حمزہؓ کے ابتدائی حالات اور اخلاق و عادات:** حضرت حمزہؓ فطرۃً بے باک، نڈر اور انتہائی بہادر شخص تھے، جرأت و شجاعت اور غیرت و حمیت جیسے سپاہیانہ اوصاف آپ کے خمیر میں داخل تھے، صفت بے نیازی، طبع لاابالی اور وصف بے فکری آپ کے مزاج کا خاصہ بنے ہوئے تھے۔آپ کا شمار مکہ مکرمہ کے قوی الجثہ اور بے حد دلیر جوانوں میں ہوتا تھا، شخصیت میں وضع داری و طرح داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، متانت و سنجیدگی کے پیکر سمجھے جاتے تھے، بلند کرداری و حسن خلقی آپ کو وراثت میں ملی تھی، قوت و طاقت کے علاوہ خاندانی شرافت و وجاہت اور خوشحالی و فارغ البالی سے بھی لوگ آپ سے متاثر و مرعوب رہتے تھے۔صلہ رحمی و غم خواری اور حسن سلوک و نیکوکاری آپ کی امتیازی خصوصیات تھیں، جس کی گواہی خود سرور کائنات و فخر موجودات نے آپ کی شہادت کے بعد دی تھی۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ''**رحمۃ اللہ علیک فانک کنت ماعملت وصولاً للرحم وفعولاً للخیرات**''(۷) یعنی تم پر خدا کی رحمت ہو، اس لیے کہ میں جانتا ہوں تم خوب صلہ رحمی کرتے تھے اور نیکیوں میں سبقت لے جاتے تھے، سیر و تفریح اور صید و شکار آپ کے محبوب مشاغل تھے، روزانہ کا معمول تھا کہ علی الصباح شکار کے لیے اپنے گھر سے نکل پڑتے اور شام کو شہر لوٹ آتے، شہر کی مصروفیات سے آپ کو کوئی سروکار نہیں تھا، مکہ مکرمہ میں جاری

سماجی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں آپ کا حصہ کم ہی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ارض مقدس کی فضا میں ارتعاش پیدا کرنے والا حق و باطل کا تصادم، دین اسلام کا تعارف اور کفر و شرک کا تحاسد جیسے غیر معمولی حالات و انقلابات سے بھی آپ کنارہ کش اور اپنی کاوشوں میں منہمک رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حمزہؓ کے سوانحی واقعات کی تفصیل اہل قلم کی گرفت میں نہیں آسکی، اور احادیث شریفہ وسیر صحابہ کے معتبر و مستند ذخائر آپ کے اجمالی تذکروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔

**حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام:** حضرت حمزہؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ وہ یہ کہ آپ ایک دن حسب معمول شکارگاہ سے گھر لوٹ رہے تھے، کوہ صفا کے بائیں پہنچے، عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ اے ابوعمار (حضرت حمزہؓ کی کنیت) ذرا سی دیر پہلے کا واقعہ ہے کہ تمہارے بھتیجے پر ابوجہل نے بڑا ظلم کیا، وہ انہیں سخت برا بھلا کہہ رہا تھا، اس نے ایذا رسانی بھی کی اور پتھر سے مار کر ان کے سر کو زخمی کر دیا جس سے خون رسنے لگا، اس قدر تکلیف سہہ کر بھی محمدؐ خاموش رہے، کچھ نہ کہا، ان کی حالت قابل رحم تھی، یہ سنتے ہی حضرت حمزہؓ کو بے حد غصہ آیا، ان کی غیرت جوش مارنے لگی۔ حالانکہ پہلے پہل حضور اکرمؐ نے خاندان عبدالمطلب کو دعوت دے کر جمع کیا اور ان کے سامنے توحید ورسالت اور عقبیٰ وآخرت کی بات کہی تو وہاں جناب ابوطالب، حضرت عباس کے ساتھ حضرت حمزہ بھی موجود تھے۔ اس وقت حضرت حمزہ نے کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کیا، مگر یہ چونکہ حمیت وناموس قرابت کا معاملہ تھا اس لیے آپ کا برانگیختہ ہونا فطری اور قرین قیاس ہے۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح ابوجہل کی تلاش میں نکل پڑے۔ جب خانہ کعبہ میں اسے دیکھا تو اس کے قریب پہنچ کر اپنی کمان سر پر دے ماری جس سے وہ زخمی ہو گیا، یہ منظر دیکھ کر ابوجہل کے قبیلے بنومخزوم کے افراد اس کی مدافعت میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ حمزہ شاید بددین ہو گئے ہیں، حضرت حمزہؓ نے جواباً کہا، ہاں! میں نے اپنے بھتیجے کا دین قبول کر لیا ہے، محمدؐ کی تائید سے مجھے کوئی روک نہیں سکے گا۔ اتنے میں حضرت حمزہؓ کے قبیلہ بنوہاشم کے لوگ بھی آپ کی مدد کے لئے پہنچ گئے۔ دونوں قبیلوں میں مڈبھیڑ ہونے ہی والی تھی کہ ابوجہل نے اپنے احباب کو خاموش کراتے ہوئے کہا ''ابوعمار کو جانے دو، واقعی میں نے ان کے بھتیجے کو آج بہت سخت گالیاں دیں۔ اس واقعہ کے بعد حضرت حمزہؓ نے گھر پہنچ کر مزید غور وفکر کیا کہ عجلت میں

لیا گیا یہ فیصلہ غلط تو نہیں (۸) مگر جب انہیں شرح صدر ہوگیا کہ یہی دین حق ہے تو آپ نے اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنے کا عہد کرلیا۔ حضرت حمزہ کے مشرف با اسلام ہونے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بے حد مسرت وشادمانی حاصل ہوئی، یہ واقعہ اواخر ماہ ذی الحجہ ٦ ھ نبوی کا ہے۔ (۹)، اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت عمر بن خطابؓ حلقہ بگوش اسلام ہونے کی غرض سے آستانۂ نبوی پر حاضری دی، اس وقت حضور اکرمؐ دار ارقمؓ میں اپنے جان نثاروں کے ساتھ تشریف فرماتے تھے، اچانک دستک ہوئی تو لوگوں نے دروازے کی درار سے جھانکا تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ شمشیر بکف باہر کھڑے ہیں، صحابہؓ حیران و پریشان ہوگئے، حضرت حمزہؓ بارگاہ نبوت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا کہ باہر عمر ہیں، حضرت حمزہؓ نے کہا، عمر کو آنے دو، اگر ان کی آمد خیر کی نیت سے ہے تو فبہا، ٹھیک ہے ورنہ انہی کی تلوار سے ان کا سر قلم کردیا جائے گا، حضرت عمرؓ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد ان کے اصرار پر حضور مصطفیؐ نے خانہ کعبہ میں علانیہ نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، چنانچہ دار ارقم سے دو صفوں میں مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر نکلے۔ اس جماعت میں ایک صف کے قائد حضرت حمزہؓ تھے اور دوسری صف کے حضرت عمر فاروقؓ تھے جس کی وجہ سے کفار و مشرکین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور مسلمان خود کو محفوظ و مضبوط سمجھنے لگے۔

**حضرت حمزہؓ کا امتیاز:** آپ کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ بعثت نبوی کے تیرھویں سال جب آپ ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچے تو آپ کی فطری بہادری و عالی ہمتی کے مدنظر سرور انبیاءؐ نے اسلام کا اولین سفید جھنڈا اپنے دست مبارک سے باندھ کر آپ کے حوالے کیا اور ماہ رمضان ا ھ میں واقع شدہ اسلام کی پہلی فوجی مہم "سریہ سِیف البحر" کا امیر آپ کو بنادیا اور آپ کے زیر کمان تیس مہاجرین دے دیے تاکہ ابوجہل کی نگرانی میں ملک شام سے آنے والے قافلہ کا راستہ روکا جائے، چنانچہ حضرت حمزہؓ مقام رغیض کے ساحل دریا کے پاس پہنچے اور تین سو افراد پر مشتمل قریش کے قافلہ کے مقابل صف آرا ہوگئے۔ لیکن قبیلہ "جُهينه" کے سردار مجدیؔ بن عمرو نے دونوں فریق میں مصالحت کرادی جس سے فضا میں چھائے ہوئے جنگ کے بادل چھٹ گئے۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کے رعب وداب کو مشرکین مکہ کے دلوں میں جگہ بنانے میں مدد دی۔

اس فوجی مہم کے چار ماہ بعد ماہ صفر ۲ ھ میں "غزوۂ ابواء" واقع ہوا جس میں شاہِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

۷۰ مہاجرین کے ہمراہ بہ نفس نفیس شریک تھے، اس غزوہ میں بھی آپؐ نے عَلَمِ اسلام کو حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں میں تھما دیا، آپؐ چونکہ اس مہم کے دوران پندرہ دن مدینہ کے باہر تھے اس لیے مدینہ میں اپنا نائب حضرت سعد بن عبادہؓ کو مقرر فرمایا۔

''غزوۂ ابواء'' کے تقریباً تین ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۲ھ ''غزوۂ ذی العشیر'' پیش آیا، جس میں دوسو کے قریب مہاجرین شامل ہوئے تھے، اور اس کی قیادت حضور اکرمؐ نے خود فرمائی تھی، اس موقع پر بھی حضرت حمزہؓ کو عَلَم برداری کا شرف حاصل ہوا تھا۔

اسلام کی اولین فیصلہ کن جنگ جو ''غزوۂ بدر'' کے نام سے مشہور ہے، ۱۷ر رمضان المبارک ۲ھ کو میدان بدر میں برپا ہوئی، اس خوں آشام معرکے کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۂ آل عمران اور سورۂ انفال میں بالتفصیل کیا ہے۔ اس حق وباطل کی ہیبت ناک وخوں ریز نبرد آزمائی میں مشرکین کو کافی زک پہنچی جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۱۳ر اور کفار کی گنتی ایک ہزار تک پہنچ چکی تھی، تاہم ان کے ستر لشکری مارے گئے اور ادھر چودہ صحابہ شہید ہوئے۔ کفار کے مقتولین میں کئی شہ زور پہلوان اور جیالے سردار بھی شامل تھے۔ اس جنگ وجدال کی ابتدا مکہ کے ایک نامور پہلوان اسودؔ بن عبدالاسد مخزومی کے قتل سے ہوئی۔ جب وہ اپنی شہ زوری پر فخر وغرور کرتے ہوئے قریش کے لشکر سے نکلا تو حضرت حمزہؓ نے آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کیا اور اسے ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی، اس کارنامے پر دشمن حیران و پریشان ہو گئے۔ اس غیر متوقع دردناک منظر نے ان کی آتش غیرت کو ہوا دی تو قریش کا مشہور سردار عتبہؔ بن ربیعہ نے اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولیدؔ کے ساتھ صفوں سے باہر نکل کر مبارزت اور دوبدو مقابلے کے لیے للکارا۔ اس کے جواب میں تین انصاری بہادر جوان آگے بڑھے، مذکورہ سرداروں نے ان سے ان کا تعارف پوچھا، جواب سننے پر کہا، تم ہمارے مرتبے اور برابر کے نہیں ہو اس لیے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے، حضور اکرمؐ نے ان کی گفتگو سنی تو حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ بن حارث کو مقابلہ آرائی کا حکم دیا۔ حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو ایک ہی وار میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حضرت علیؓ نے ولید کا کام جلد ہی تمام کر دیا لیکن حضرت عبیدہؓ شیبہ پر حملہ آور ہوتے ہوئے زخمی ہو گئے، اتنے میں حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ ان کی مدد کو آ گئے شیبہ کا بچنا ناممکن تھا، نتیجتاً وہ

واصل جہنم ہوگیا۔(۱۱) کفار مکہ نے جب یہ دیکھا کہ بہ یک جنبش تیغ ان کے تین سورما قتل کردیے گئے تو انہیں بے حد شرمندگی ہوئی، ان کا غیظ وغضب بھڑک اٹھا اور وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں سے متصادم ہوگئے۔ بدر کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا، عرب کے شہ زوروں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی امتیازی شان کے ساتھ جنگ میں شامل ہوتے تھے، اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے حضرت حمزہؓ نے بھی اپنی دستار میں شترمرغ کا پَر لگا رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ میدان جنگ میں جس طرف بھی جاتے نگاہوں کا مرکز بنے رہتے۔ مزید برآں آپ کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں، جن کی زد میں آنے والا خاک وخون میں غلطاں نظر آتا، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کا ارشاد ہے کہ قریش کے سردار امیہ بن خلف نے مجھ سے دریافت کیا کہ بدر کے میدان میں شترمرغ کی کلغی کس نے لگا رکھی تھی، میں نے کہا وہ رسول اللہؐ کے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب تھے، یہ سن کر امیہ نے کہا واللہ یہ وہی شخص ہے جس نے ہمارے خلاف بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔(۱۲)

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی شاندار فتح وکامرانی کے بعد "بنوقینقاع" نامی یہودیوں کی ایک بااثر جماعت بغض وحسد میں مبتلا ہوکر سرکشی وعہد شکنی پر آمادہ ہوگئی حالانکہ یہودیوں کے اس گروہ نے حضورؐ سے امن وسلامتی کا معاہدہ کیا تھا، اس کے باوجود جب ان کی زیادتیاں حد سے تجاوز کرگئیں تو آپؐ نے ان کی سرکوبی کے لیے شوال ۳ھ میں ایک عسکری دستہ روانہ فرمایا جس کی علم برداری کا منصب حضرت حمزہؓ ہی کو تفویض کیا گیا۔(۱۴)

غزوۂ احد فتح وشکست سے مملو خوف ناک جنگ تھی، جس کا بیان سورۂ آل عمران میں مفصل موجود ہے۔ اس جنگ میں جاں نثاران اسلام تقریباً سات سو تھے اور کفار کی تعداد ہزاروں میں تھی، یہ معرکہ دراصل غزوۂ بدر میں قریش کی شکست فاش کا انتقام لینے کے لیے تھا، جیسا کہ قائد قریش ابوسفیان نے کہا "آج کا دن بدر کا جواب ہے۔(۱۵)، اس سخت وعظیم معرکے میں پہلے پہل مسلمانوں کو کفار ومشرکین پر بالادستی حاصل ہوئی مگر "جبل رماۃ" پر متعین تیراندازوں کی ایک چوک اور بے صبری کی وجہ سے فتح وکامرانی شکست وہزیمت میں بدل گئی، اس پرہول وپرخطر لڑائی میں بقول علامہ شبلی نعمانی "حضرت حمزہ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھا" (۱۶)، احد میں زرہ پوش سپاہی صرف ایک سو ہی تھے، باقی لوگوں کی کمان آپ کے سپرد تھی۔ حضرت حمزہؓ مدینہ سے باہر نکل کر کھلے میدان میں

روبرو لڑنے کے پرجوش حامی تھے اور میدان بدر میں اپنا کمال ہنر دکھا چکے تھے۔(۱۷)، جب ۷/ شوال بروز شنبہ عام تصادم سے پیشتر جنگی رواج کے مطابق کفار کا پہلوان سباغ بن عبدالعی غشانی نے مبارزت طلب کی تو شیر خدا یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ''اے ام انمار مضغہ نجس کے بچے! کیا تو خدا اور اس کے رسول سے لڑنے آیا ہے! پھر آپ نے تلوار سے اس پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ گزرتے ہوئے دن کی طرح ماضی کا حصہ بن گیا۔(۱۸)، جنگ کی باقاعدہ ابتداء ہوئی تو مشرکین کا علمبردار بنی عبدالدار کا نوجوان عثمان بن ابی طلحہ نے صف سے آگے نکل کر یہ رجزیہ شعر پڑھتے ہوئے آیا ؎

ان علیٰ اھل اللواء حقا ان تخضب الصعدۃُ او تندقّا

علم برداروں کا یہ حق ہے کہ ان کا نیزہ سرسبز ہوجائے یا ٹوٹ جائے۔

حضرت حمزہ نے یہ سنا تو اس کا راستہ روک کر ایسا زبردست وار کیا کہ تلوار اس کے کندھے کو کاٹتی ہوئے ناف تک اس طرح اتری کہ اس کا پھیپھڑا نظر آنے لگا، پھر تھوڑی دیر کے بعد بنی عبدالدار کا آخری علمبردار ارطاۃ بن شرجیل نمودار ہوا تو اس شیر خدا نے ارطاۃ کا بھی وہی حشر کیا اور اسے بھی لقمہ اجل بنا دیا۔(۱۹) غرض کہ حضرت حمزہؓ جدھر بھی رخ کرتے ادھر کشتوں کے پشتے لگا دیتے، آپ کے آگے دشمن کا کوئی بھی سورما ٹھہرتا نہیں تھا، جو بھی آپ کے ارد گرد منڈلاتا گاجر مولی کی طرح کٹ کر گرتا جاتا، اس طرح آپ نے تیس کافروں کو ٹھکانے لگا دیا، دراصل آپ وہ شیر خدا تھے جس کی شجاعت کی دھاک ہر جنگ جو کے سینے میں بیٹھی ہوئی تھی، آپ جیسے پیکر جرأت و ہمت سے ٹکرانا اور روبرو مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے دشمن نے سازش کے تحت آپ پر بزدلانہ حملہ کرایا، جس سے آپ جانبر نہ ہوسکے، شہید ہوگئے۔ یہ حادثہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان تھا، جس کی بھرپائی آخر تک نہ ہوسکی۔

**حضرت حمزہؓ کی شہادت:** جنگ احد بظاہر بدلے کی کارروائی ہونے کے باوجود منظم و منضبط طریقہ پر لڑی گئی تھی، اس لیے جوش انتقام سے بھرے ہوئے پس ماندگان مقتولین نے معرکہ آرائی سے پیشتر ہی انفرادی طور پر بعض اہم شخصیتوں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ سردار قریش جبیر بن مطعم نے اپنے چچا طعیمہ بن عدی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اپنے حبشی غلام وحشی بن حرب کو یہ لالچ دیا کہ وہ حضور پُرنورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کردے گا تو اس کی گردن سے غلامی کا طوق نکال دیا

جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے گا۔ چونکہ حضرت حمزہؓ جنگ بدر میں جبیر کے چچا کو واصل جہنم کر چکے تھے اس لیے اس کا سینہ انتقام کی آگ سے دہک رہا تھا، وحشی نے پیش کش قبول کر لی اور دیگر افراد کے ساتھ میدان احد میں پہنچ گیا۔ وحشی اپنے ہم قوم حبشیوں کی طرح حربہ اندازی میں ماہر تھا، اس کا نشانہ شاذ و نادر ہی خطا کرتا تھا، غرض جب جنگ اپنے شباب پر پہنچ گئی تو وہ شیر خدا کو تلاش کرنے لگا، اچانک حضرت حمزہ دکھائی دیے۔ وحشی کا بیان ہے کہ ''حضرت حمزہؓ خاکستر اونٹ معلوم ہو رہے تھے، لوگوں کو درہم برہم کرتے جاتے تھے، ان کے سامنے کوئی چیز ٹک نہیں پاتی تھی'' (۱۹)، وحشی ایک چٹان کی آڑ میں حضرت حمزہؓ کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا، جب آپ اس کے نشانے پر آ گئے تو اس نے اپنا نیزہ پوری قوت کے ساتھ پھینکا جو آپ کے ناف کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف نکل گیا، حضرت حمزہ اس غیر متوقع حملہ کے باوجود اپنے اوسان بحال رکھ کر اس کی طرف جھپٹے مگر چکرا کر زمین پر گر گئے۔ اسی وقت آپ کی پاکیزہ روح جسد عنصری چھوڑ کر ملأ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی، آخری وقت میں بھی آپ کے قدم آگے ہی بڑھے، پیچھے نہیں ہٹے، اسلام کی خاطر راہِ خدا میں آپ کی قربانی و جاں نثاری اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آ گئی کہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس سے آپ کو ''سید الشہداء'' کے لقب سے سرفراز فرمایا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت سے مہاجرین و انصار سبھی بے حد غمزدہ و رنجیدہ ہو گئے تھے، خصوصاً آپ کے بھتیجے اور رضاعی بھائی رسول اللہؐ کے قلب اطہر پر جو کیفیت گزری ہوگی اس کا علم خدا ہی کو ہے، حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت حمزہ کی ناک، کان وغیرہ اعضا سے مبرا مثلہ شدہ نعش دیکھی تو بے اختیار رو پڑے اور آپ کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ جب طبیعت قابو میں آئی تو ایک انصاری کے پاس سے کپڑا لے کر نعش پر ڈال دیا اور فرمایا قیامت کے دن تمام شہداء کے سردار حمزہؓ ہوں گے۔ (۲۱) علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب پر جس طرح روئے اس سے بڑھ کر روتے ہوئے ہم نے آپؐ کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپؐ جب جنازے پر کھڑے ہوئے تو روتے ہوئے آواز بلند ہو گئی۔ (۲۲)، حضرت صفیہ حضرت حمزہ کی حقیقی بہن تھیں، وہ اشک بار آنکھوں سے جنازے کے پاس آئیں تو آپ نے انہیں دلاسا دے کر روانہ فرمایا، میت کا دیدار کرنے نہیں دیا، مبادا کہیں وہ بے قابو نہ ہو جائیں، حضرت صفیہؓ

کفن کے لیے دو چادریں لائی تھیں، ان میں سے ایک بے کفن انصاری کو دے دی گئی جن کا جسدِ خاکی حضرت حمزہؓ کے پاس ہی تھا، دوسری چادر سے آپ کا چہرہ ڈھانپا گیا، پیروں پر گھاس ڈال دی گئی۔ سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سید الشہداء کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر آپ ہر جنازے کو حضرت حمزہ کے پہلو ہی میں رکھ کر نماز پڑھاتے رہے، چونکہ شہدائے احد کی تعداد ستّر تھی اس طرح سید الشہداء کی نماز جنازہ ستّر بار پڑھی گئی (۲۳)، بعدازاں وہیں آپ کی تدفین عمل میں آئی، قبر میں حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ اترے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کنارے تشریف فرما تھے۔ تجہیز و تکفین کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لائے، تو ہر گھر سے اپنے اپنے مرحومین کے لیے آہ و زاری اور ماتم کرنے کی آوازیں آرہی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے چچا کی یاد آ گئی، آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا "اما حمزۃ فلا بواکی لہ" حضرات انصار نے یہ سنا تو تڑپ گئے، اپنی خواتین کو حضرت حمزہ کا ماتم کرنے کے لیے آپ کے دولت کدہ پر روانہ کیا۔ وہ عرب کے دستور کے مطابق نوحہ کرنے لگیں، جب آوازیں بلند ہوگئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھر سے باہر تشریف لا کر ان کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا آج سے کسی مرحوم کا ماتم نہ کیا جائے، یعنی چیخنا، چلانا، کپڑے پھاڑ لینا وغیرہ حرکتیں جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھیں اسلام میں منع کر دی گئیں۔ (۲۴)

حضرت حمزہؓ کی شہادت کا اشارہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعہ خواب مل چکا تھا، ہوا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ کفار مکہ کی کثیر فوج مدینہ کے لئے نکل چکی ہے اور اس کا آخری پڑاؤ بتاریخ ۶/ شوال ۳ھ بروز جمعہ کوہ احد کے قریب مقام عینین پر ڈال دیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجلس شوریٰ منعقد فرما کر جنگی حکمت عملی کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا خواب یوں بیان فرمایا، آپؐ کی موجودگی میں چند گائیں ذبح کی گئی ہیں اور آپؐ کی تلوار کا سرا کٹا ہوا ہے اور آپؐ اپنا دست مبارک ایک محفوظ زرہ میں داخل کئے ہوئے ہیں، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی خواب کی تعبیر سنا دی کہ چند گایوں کا ذبح کیا جانا بعض صحابہؓ کی شہادت کی طرف اشارہ ہے، تلوار کے سرے کی شکستگی آپؐ کے گھر کے کسی خاص آدمی کی شہادت کی علامت ہے اور محفوظ زرہ سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ (۲۵)، ظاہر ہے کہ گھر کے خاص مرد حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ہی ہیں۔ آپؐ نے خواب اور اس کی تعبیر بتلا کر یہ واضح فرما دیا کہ مسلمانوں کو مذکورہ آزمائشوں سے گزرنا ہے اور خود کو ہر طرح کی صعوبتوں

کے لیے تیار رکھنا ہے۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں نے دیکھا کہ شہداء کی نعشیں مثلہ کی گئی ہیں اور ان کے اعضا کاٹ دیے گئے ہیں جیسا کہ دشمنوں کے مقتولین کے خلاف عرب اقوام کا طریقہ تھا جس کا اقرار کرتے ہوئے ابوسفیان نے کہا تھا "فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لیے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں ہوا" (۲٦)، اس المناک صورت حال کو دیکھ کر لوگوں کے دل بھر آئے اور وہ بے اختیار رو پڑے، خصوصاً حضرت حمزہؓ کی نعش کے ساتھ جو بے حرمتی کی گئی وہ وحشت انگیز اور لرزہ براندام کرنے والا منظر تھا۔ آپ کی نعش کا نہ صرف مثلہ کیا گیا بلکہ سینہ چیر کر کلیجہ نکالا گیا اور اسے چبا کر تھوک دیا گیا تھا، سیرت کی تمام کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے اور اس بہیمانہ سلوک اور انسانیت سوز حرکت کی نسبت ابوسفیان کی اہلیہ ہند بنت عتبہ کی طرف کی گئی ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ ہند نے ان اعضا کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لیا اور اس کا مظاہرہ بھی کیا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس سخت ترین عداوت کا سبب یہ بتایا گیا ہے چونکہ جنگ بدر میں ہند کے والد عتبہ کا قتل شیر خدا حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں ہوا تھا اس لیے اس نے آپ سے انتقام لینے کی خاطر جبیر بن مطعم کے حبشی غلام وحشی بن حرب کو آزادی کا لالچ دے کر حضرت حمزہ کے قتل پر آمادہ کر لیا اور جب اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تو اسے بطور انعام اپنے گلے کا ہار بھی دے دیا، ہند نے اس پر بس نہیں کرتے ہوئے حضرت حمزہ کا شکم چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا اور اسے نگلنا چاہا مگر یہ ممکن نہ ہوا تو تھوک دیا، اسی لیے ہند کو جگر خوارہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب اس کی اطلاع حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اس نے کچھ کھایا بھی ہے، لوگوں نے جواب دیا "نہیں"۔ یہ سن کر آپ نے دعا کی کہ اللہ، حمزہ کے کسی جز کو جہنم میں داخل ہونے نہ دے۔ (۲۷)، اس قصے کو سب سے پہلے سیرت کا حصہ بنانے والی شخصیت محمد اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) کی ہے، پھر اس کا اتباع مورخ واقدی (متوفی ۲۰۷ھ) نے کیا بعدازاں ابن ہشام (متوفی ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ)، ابن سعد (متوفی ۲۳۰ھ)، ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، عبدالرحمان سہیلی وغیرہ نے ابن سعد کی پیروی کی۔ بعدازاں مذکورہ مورخین کی تصنیفات کو امہات الکتب کا درجہ دے کر اردو کے تمام سیرت نگاروں نے اس قصہ کو شامل کیا، اس طرح ہند سے منسوب یہ واقعہ زیب داستاں ہی نہیں

بلکہ روح داستاں بن کر چہار دانگ عالم میں شہرت پا گیا۔ یہاں تک کہ داستاں نویسوں نے ''داستانِ امیر حمزہ'' بھی کئی جلدوں میں تحریر کی، حاجی ہمدانی قصہ گو نے فارسی میں ایک ضخیم کتاب ''رموز حمزہؓ'' ۹۸۸ھ اور ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۸۰ء اور ۱۵۹۰ھ کے درمیان تصنیف کی ، پھر وہ داستان ، گولکنڈہ (حیدرآباد) کے سلطان محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۱ء) کے گوش گزار کی گئی جسے سن کر سلطان نے ہدایت کی کہ اسے مختصر پیرائے میں بیان کیا جائے چنانچہ حاجی ہمدانی نے ''زبدۃ الرموز'' (۱۰۲۱ھ م ۱۶۱۲ء) کے عنوان سے ''رموز حمزہ'' کی تلخیص کی، جس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ (بہار) میں محفوظ ہے۔ دکنی زبان میں ''قصہٴ جنگ امیر حمزہؓ'' کے نام سے کسی نامعلوم شخص نے ۱۲۰۲ھ م ۱۷۸۱ء میں لکھا جو کتب خانہ پیرس (Paris) کی زینت ہے۔ بعد ازاں اردو میں ''رموز حمزہ'' کی بنیاد پر ''داستان امیر حمزہؓ'' ۱۲۱۸ھ۔۱۲۱۹ھ م ۱۸۰۳/و ۱۸۰۴ء میں بمقام کلکتہ تصنیف کی گئی۔ اس کے مصنف خلیل علی اشک نے اس کتاب کو دنیا جہاں کے قصوں، مافوق الفطرت واقعات، جنگی کارناموں کو اشعار سے سجایا جس سے یہ داستان بے حد دلچسپ، بہت دل پذیر اور پر لطف ہوگئی۔ داستان امیر حمزہ عام شائقین کے علاوہ شہزادوں کو بھی سنائی جاتی تھی تا کہ ان میں لطف اندوزی کے ساتھ جہاں بانی وحکمرانی کا بھی شوق فزوں ہوجائے۔ ''داستان امیر حمزہ'' مطبع نول کشور، لکھنؤ سے ۱۸۸۳ء تا ۱۸۹۳ء آٹھ جلدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی، جس کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے اردو کے بلند پایہ مشہور و معروف نقاد و محقق، شاعر وادیب پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے ''ساحری، شاہی اور صاحب قرانی۔ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' کے نام سے ضخیم کتاب تحریر کی۔

راقم الحروف اس موقع پر ہند بنت عتبہ کے جگر چبانے سے متعلق چند مشہور سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں کے بیانات پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ جناب اسلم جیراج پوری، ''ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے سید الشہداء حضرت حمزہ کی نعش کا مثلہ کیا، یعنی ناک کان وغیرہ کاٹ ڈالے، آنکھیں نکالیں، اور سینہ چاک کر کے جگر کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبایا لیکن نگل نہ سکی اسے اگل دیا، اسی وجہ سے اس کا لقب جگر خوارہ رکھا گیا۔ (تاریخ امت، ص: ۱۳۸)

علامہ شبلی نعمانی:　　''خاتون قریش نے انتقام بدر کے شوق میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا، ان کے ناک، کان کاٹ لیے۔ ہندہ (حضرت امیر معاویہ کی ماں) نے ان کا ہار بنایا اور اپنے

گلے میں ڈالا، حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اوران کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے نہ اتر سکا، اس لیے اگل دینا پڑا، تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوارہ لکھا جاتا ہے وہ اس بنا پر لکھا جاتا ہے"۔ (سیرت النبیؐ حصہ اول: ص ۳۸۳)

حکیم عبدالرؤف داناپوری: ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ہندہ بنت عتبہ اوراس کے ساتھ کی عورتوں نے شہدائے احد کا مثلہ کیا، ان کے کان اور ناک کاٹ کر ان کا ہار بنایا اور اپنا ہار ہندہ نے خوشی سے وحشی حبشی قاتل حمزہؓ کو دے دیا۔ حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے ان کا جگر نکال کر چبایا اور بہت سے فخریہ اشعار پڑھے۔" (اصح السیر: ص: ۱۵۳)

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری: کچھ مشرکین مرد اور عورتیں مسلمان شہداء کے مثلہ میں مشغول ہوگئیں یعنی شہیدوں کی شرمگاہیں اور ناک کان وغیرہ کاٹ لئے، پیٹ چیر دیئے۔ ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چاک کیا اور منہ میں ڈال کر چبایا اور نگلنا چاہا لیکن نگل نہ سکی تو تھوک دیا اور کٹے ہوئے کانوں اور ناکوں کا پازیب اور ہار بنایا۔" (الرحیق المختوم۔ص: ۴۳۰)

مولانا حاجی معین الدین ندوی: اس شیر خدا کی شہادت پر کفار کی عورتوں نے خوشی و مسرت کے ترانے گائے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے ناک، کان کاٹ کر زیور بنائے، نیز شکم چاک کر کے جگر نکالا اور چبا چبا کر تھوک دیا۔" (مہاجرین حصہ اول، ص: ۱۹۲)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ہند بنت عتبہ اور دوسری خواتین مسلم شہداء کا مثلہ کرنے لگیں، منہ، ناک، کان وغیرہ تراشے اوراس کے ہار، پازیب وغیرہ بنائے، حضرت حمزہؓ کا جگر چیر کر چبا ڈالا، اسے نگلنا چاہا مگر نگل نہ سکی تو تھوک دیا اور اونچی چٹان پر چڑھ کر یہ اشعار پڑھے۔

نحن جزیناکم لیوم بدر    والحرب بعد الحرب ذات سعی

ہم نے تم سے بدر کا بدلہ لے لیا، ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ زیادہ جوش وخروش سے ہوتی ہے۔

ماکان من عتبة لی من صبر    ولا اخی وعمّه وبکری

عتبہ کا غم میرے لیے ناقابل برداشت تھا اور میرے علاوہ میرے بھائی، اس کے چچا اور میری اولاد کے لیے بھی۔ (تہذیب سیرت ابن ہشام، ص: ۱۳۹)

مذکورہ مورخوں کے بیانات کو پڑھنے کے بعد ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ اس

خوفناک جنگ میں جبکہ دونوں فریق نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، فتح وشکست کے مناظر بدلتے رہے تھے، ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی، آخر آخر میں مسلمانوں کو اپنی جان سے بڑھ کر حضور اکرمؐ کی حفاظت کی فکر دامن گیر تھی، سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی، میدان کارزار میں خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے، مقتولین کی نعشیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں، گرد وغبار میں آلودہ ہوکر صاف پہچانی نہیں جاتی تھیں، ایسے میں اس قدر باریک بینی سے حالات کا معائنہ کس نے کیا؟ بالخصوص اس کی تاک میں کون تھا کہ ہند بنت عتبہ نے کس کی نعش کا مثلہ کیا؟ کون سے اعضا کا ہار بنایا؟ کس طرح شکم چیر کر جگر نکالا؟ کھایا یا تھوک دیا؟ ایسے دل دہلانے والے خونی معرکہ میں ان باتوں کی طرف دھیان دینا ناممکن اور فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے۔

شہدا کی نعشوں کو مثلہ کرنے والوں میں بقول ابوسفیان مرد وعورت سبھی تھے، عورتوں میں ہند کے علاوہ سر براہان قریش کی مقتدر خواتین بھی تھیں جیسے ام حکیم بنت حارث، فاطمہ بنت ولید، برہ بنت مسعود، بریطہ بنت منبہ، سلافہ بنت سعد وغیرہ، ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا گیا صرف ہند (اصل لفظ ہند ہے ہندہ نہیں) کا تذکرہ کیوں کیا گیا؟

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ہند نے وحشی بن حرب کو آزادی کی امید دلا کر حضرت حمزہ کے قتل پر آمادہ کیا تھا، یہ کیسے ممکن تھا جبکہ وحشی ہند کا غلام نہیں تھا، آزاد کرنے کا اختیار اس کے آقا جبیر بن مطعم کو حاصل تھا، ہند کو نہیں، پھر وہ کیسے آزادی کی بات کر سکتی ہیں۔

ہند سے منسوب اس من گھڑت اور مصنوعی واقعہ کا ذکر جنگ احد میں شامل کسی صحابی نے نہیں کیا، حتی کہ کفار مکہ کی طرف سے لڑنے والوں میں سے کئی بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، مثلاً حضرت ہندؓ بنت عتبہ، حضرت ام حکیم بنت حارثؓ، حضرت فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ، حضرت ابوسفیانؓ، حضرت عکرمہ بن ابی جہلؓ، حضرت حارث بن ہشامؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت صفوان بن امیہؓ، حضرت جبیر بن مطعمؓ، حضرت وحشی بن حربؓ وغیرہ ان صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا خود حضرت وحشی بن حرب نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد حضرت عبیداللہ بن عدیؒ کے استفسار پر قتل کرنے کا سارا واقعہ سنایا، امام بخاریؒ نے اس حدیث کو جعفر بن عمرو بن امیہ الضمریؒ سے نقل کیا ہے، اس تفصیل میں کہیں حضرت ہند بنت عتبہ کا نام نہیں آیا

اگر حقیقتاً ہند سے آزادی کا معاہدہ طے ہوتا اور قتل کے بعد انعام میں ہند نے اپنا ہار دیا ہوتا تو اس واقعہ کا اظہار ضرور کیا جاتا، اس میں چھپانے یا نظر انداز کرنے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ علاوہ ازیں ہند کو "جگر خوارہ" کا لقب کس نے دیا حالانکہ یہ لفظ فارسی الاصل ہے، عربی میں رائج نہیں ہے۔

حضرت وحشیؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دامن اسلام میں پناہ لی تھی تو رحمۃ للعالمینؐ نے ان سے صرف اتنا فرمایا کہ تم کیا اپنا چہرہ مجھ سے نہیں چھپا سکتے؟ اس کے بعد حضرت وحشیؓ کبھی حضور پر نورؐ کے روبرو نہیں آئے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے چہیتے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی یاد تازہ نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ حضرت وحشیؓ کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر ابھارنے والے ان کے آقا حضرت جبیر بن مطعم کے ساتھ بھی رحمت مجسمؐ نے حسن سلوک فرما کر انہیں بھی معاف فرما دیا۔ اس طرح شریعت مطہرہ کے ابدی قانون "**ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ**" یعنی اسلام پچھلے تمام گناہوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے، کو جاری فرمایا۔

حضرت ہند سے اگر یہ جرم قبیح سرزد ہوا ہوتا جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہوتے جیسا کہ حضرت وحشی کے تعلق سے ہوا تھا۔ اس کے برعکس حضرت ہند (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش دامن اور امیر المومنین حضرت ام حبیبہؓ کی والدہ) نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد جس طرح اپنے دلی جذبات کا اقرار برملا کیا تھا اور کہا تھا "**یا رسول اللہ ما کان علی ظھر الارض من اھل خباء احب الی ان یذلو امن اھل خبائک ثم ما اصبح الیوم علی ظھر الارض اھل خباء احب الی ان یعزّ وا من اھل خبائک**" یعنی روئے زمین پر جتنے خیمہ والے بستے ہیں، ان میں آپؐ سے زیادہ میری نگاہوں میں کوئی (نعوذ باللہ) پست نہیں تھا لیکن اب روئے زمین کے تمام بسنے والوں میں مجھے آپ سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے۔ حضور اکرمؐ نے ان کے جواب میں اسی جذبے کے ساتھ محبت بھرے کلمات ارشاد فرمائے۔ چنانچہ ارشاد گرامی ہوا "**و ایضا و الذی نفسی بیدہ**" (بخاری جلد اول، ص: ۵۳۹) (۲۸)، یعنی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میرا بھی یہی حال ہے، بالفاظ دیگر تم نے جس شدت سے محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے میں بھی اسی شدت سے اپنی رضامندی اور چاہت کا اعلان کرتا ہوں۔ حضور اکرمؐ کے انہیں کلمات کے مدنظر حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں **فضل ھند**

بنت عتبہ کی سرخی قائم کی۔

اب رہا سوال کہ حضرت ہند سے منسوب اس افسانے کا موجد کون ہے؟ محققین کی رائے میں اس کا جواب یہ ہے کہ غزوۂ احد (۷/شوال ۳ھ) کے ایک صدی بعد منصۂ شہود پر ظاہر ہونے والے مشہور مورخ و محدث محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) نے سب سے پہلے اپنی کتاب ''المغازی'' میں اس قصہ کو بیان کیا تھا، ابن اسحاق نے اس روایت کو حضرت صالح بن کیسان تابعی (متوفی ۱۴۰ھ) سے نقل کرنے کا دعویٰ کیا ہے جبکہ احد کا معرکہ حضرت صالح کی ولادت سے سترّ سال پہلے رونما ہو چکا تھا۔ حضرت صالح سے روایت صرف ابن اسحاق نے کی، پھر ابن اسحاق سے تنہا سلمۃ الابرش اور ان سے صرف محمد بن حمید پھر ابن حمید سے ابن جریر نے فقط روایت کی، حضرت ابن جریر الطبریؒ کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی، اس طرح ۷۰ھ تا ۳۱۰ھ تقریباً ۲۵۰ سال کے دوران ہر زمانے میں ایک ایک شخص نے اس قصہ کو نقل کیا کسی دوسرے راوی سے نہ سنا گیا اور نہ حضرت ہند سے منسوب یہ روایت منظر عام پر آئی۔

محدث ابن اسحاق کی شخصیت محدثین و ماہرین اسماء الرجال کے نزدیک اختلافی اور مخدوش سمجھی گئی ہے۔ بعضوں نے آپ کو ثقہ تسلیم کیا ہے اور بعضوں نے اس سے اختلاف کیا ہے، چنانچہ امام اسماء الرجال حضرت یحییٰ ابن سعید القطانؒ نے ابن اسحاق کی روایتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ امام نسائی فرماتے ہیں یہ (ابن اسحاق) قوی نہیں ہے۔ دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث حجت نہیں ہے۔ امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ ابن اسحاق قدری مسلک کے حامل اور معتزلہ کے پیروکار ہیں۔ امام سلمان تیمیؒ کا بیان ہے کہ وہ کذاب ہیں۔ امام مالک نے بھی انہیں کذاب کہا ہے، محدث عبدالرحمن بن مہدیؒ نے اطلاع دی ہے کہ حضرت یحییٰ بن سعید القطان اور امام مالک دونوں ابن اسحاق کو مجروح قرار دیتے ہیں، امام سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں میں نے مسجد خیف میں ابن اسحاق کو دیکھا تھا، مجھے تو اس کے پاس جاتے ہوئے بھی ڈر محسوس ہوا کہ کہیں لوگ مجھے ''قدری'' نہ کہنے لگیں۔ حضرت ابوعمر و شیبانیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ابن اسحاق کو دیکھا ہے کہ وہ احادیث و روایات لکھ کر شعراء کے پاس لے جایا کرتا اور ان سے کہتا کہ ان مضامین پر اشعار لکھ دو، پھر ان اشعار کو صحابہ کرامؓ کی جانب منسوب کر دیتا۔ یہی حضرت علامہ ابوبکر الخطیب بغدادی نے اپنی کتاب ''تاریخ بغداد'' میں لکھا ہے۔ (۲۹)

سید الشہداء حضرت حمزہؓ فطرۃً چونکہ سپاہیانہ مزاج کے حامل اور عسکری طبیعت کے مالک تھے، اس لیے آپ کے سوانح نگاروں نے انہیں اہداف کا تعاقب کیا جس میں آپ کی بہادری و پامردی عیاں ہوتی ہو اور آپ کی قوت وطاقت کا مظاہرہ ہوتا ہو، آپ کے معاشرتی حالات اور مجلسی واردات کا تذکرہ خال خال ہی ملتا ہے، آپ کے رزمیہ احوال بہت زیادہ مشہور ہیں، مگر آپ کے بزمیہ اقوال کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں چلتا، البتہ لے دے کے ایک واقعہ صحیح بخاری کے حوالے سے تمام کتب سیر میں بیان کیا گیا ہے جس کے راوی حضرت حسینؓ ہیں جو اپنے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہؓ سے روایت کرتے ہیں، اس واقعہ کا خلاصہ یوں ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی دو اونٹنیوں کو جو انہیں بدر کے مال غنیمت اور حضور اکرمؐ کے حصہ خمس میں عطا ہوئے تھے، حضرت فاطمہؓ سے نکاح کرنے اور رخصتی ہوجانے کے بعد دعوت ولیمہ میں استعمال کرنے کی نیت سے ایک انصاری کے گھر کے پاس باندھ رکھا اور خود ضرورت سے باہر تشریف لے گئے تھے، جب اپنے کام سے فارغ ہوکر اپنی اونٹنیوں کے پاس آکر دیکھا تو وہ مری پڑی تھیں، ان کے کوہان کاٹے گئے تھے اور پیٹ چاک کرکے جگر لے لیا گیا تھا، یہ منظر آپ کے لئے ناقابل برداشت تھا، بے حد رنجیدہ خاطر ہوگئے، آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ان کے چچا حضرت حمزہؓ نے یہ نازیبا حرکت کی ہے اور وہ پڑوس کے گھر پر واقع محفل رنداں میں تشریف فرما ہیں، شغل مئے نوشی جاری ہے اور ایک مغنیہ گارہی ہے، اسی نے حضرت حمزہ کو اونٹنیوں کے ذبح پر ابھارا تھا۔ یہ سنتے ہی حضرت علیؓ حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال کی خبر دے کر حضرت حمزہؓ کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں اس وقت خادم خاص حضرت زید بن حارثہؓ موجود تھے، آپؐ نے ہجرت کے بعد حضرت زید کو حضرت حمزہ کا مواخاتی بھائی بنایا تھا اسی لیے حضرت حمزہ انہیں بہت چاہتے تھے، یہاں تک کہ جب بھی آپ کو غزوات وسرایا میں جانے کا اتفاق ہوتا تو انہیں کو وصیت کرتے تھے، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؓ اور حضرت زید کو ساتھ لے کر اس بزم طرب میں تشریف لائے اور حضرت حمزہ کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کی، حضرت حمزہ نشہ میں چور تھے، آنکھیں سرخ ومخمور اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، وہ بوجھل آنکھوں سے حضور پرنورؐ کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ سر اٹھاتے ہوئے آپؐ کے چہرۂ انور کی طرف دیکھا اور کچھ توقف کے بعد کہا، تم سب میرے باپ کے غلام ہو، یہ سنتے

ہی آپؐ جان گئے کہ وہ بدمست و مدہوش ہیں، پھر آپؐ الٹے پاؤں واپس لوٹ آئے، حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ہم بھی آپؐ کے ہمراہ واپس ہو گئے۔(۳۰)

اس حدیث کو بیان کر کے علامہ ابن حجر عسقلانی نے حضرت حمزہ سے متعلق دو باتوں کی وضاحت کی ہے، ایک یہ کہ مذکورہ واقعہ شراب کی حرمت سے پہلے کا ہے۔ راقم کہتا ہے کہ یہ واقعہ ۳ھ میں جنگ احد سے پہلے رونما ہوا ہوگا، یہ اس لیے کہ حدیث کی ابتدا میں حضرت فاطمہؓ کے نکاح اور دعوت ولیمہ کا ذکر کیا گیا ہے، حضرت فاطمہ کا نکاح بقول شبلی نعمانیؒ ماہ ذی الحجہ ۲ھ میں ہوا، اور رخصتی سیرت بن ہشام کے مطابق چند ماہ بعد ہوئی، اس طرح ۳ھ کے وسط میں حضرت علیؓ نے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا ہوگا، اسی موقع پر حضرت حمزہ کے متعلق مذکور واقعہ پیش آیا، اور پھر ماہ شوال ۳ھ میں جنگ احد میں حضرت حمزہؓ کی شہادت ہوگئی، اس کے بعد میں ۴ھ میں شراب کی مکمل حرمت کا حکم نازل ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر و المیسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (سورۂ مائدہ: آیت: ۹۰) یعنی اے ایمان والو، بات یہی ہے کہ شراب اور جواب اور بت اور قرعے کے تیر سبھی گندے شیطانی کام ہیں، ان سب سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شراب کے عادی اصحاب نے جب مذکورہ حکم سنا تو اپنے جام و سبو سر راہ لاکر توڑ دیے، بخاری باب مظالم میں ہے "فجرت فی سکک المدینہ" یعنی مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح شراب بہہ گئی (۳۱)، اس کے بعد صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ کو جو سرزنش کی تھی وہ شراب نوشی کے سلسلہ میں نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی اونٹنیوں کو بغیر اجازت ذبح کرنے کے بارے میں تھی۔

حضرت علامہ ابن حجرؒ نے دوسری بات یہ بتائی کہ حضرت حمزہؓ نے بطور افتخار کے کہا تھا "تم سب میرے باپ کے غلام ہو، کیونکہ عربوں کے نزدیک جد یعنی دادا خاندان کا آقا ہوتا ہے اور باقی اہل خانہ اس کے غلام کی طرح ہیں۔

راقم تاریخ اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے اس واقعہ کے متعلق عرض کرتا ہے کہ حضرت حمزہؓ اپنے دوستوں کی محفل میں حسب معمول بادہ نوشی میں مصروف تھے، وہاں موجود مغنیہ نے (رقاصہ نہیں جیسا کہ سیر الصحابہ میں ہے) باہر بندھے ہوئے اونٹیوں کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے یہ مصرع پڑھا ''الا یا حمزۃ للشرف النواء'' یعنی اے حمزہ موٹی اور فربہ اونٹنیوں کے لیے تیار ہوجایئے تو آپ فوراً محفل سے اٹھ کر اونٹنیوں کے پاس پہنچے (ممکن ہے کہ انہوں نے وہاں پوچھا بھی ہو کہ یہ کس کی ہیں، جواباً حضرت علیؓ کا نام لیا گیا تو یہ سوچ کر کہ وہ اپنے ہی بھتیجے کی ملکیت ہیں ) اور انہیں ذبح کیا، پھر جگر نکال کر پیش کیا (ظاہری بات ہے کہ اسے بھون کر ہی کھایا ہوگا ) کافی وقت کے بعد جب کھانے پینے کی محفل اختتام پذیر تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے اونٹنیوں کو خواہ مخواہ ذبح کر دینے پر سرزنش کی، اس وقت حضرت حمزہ پوری طرح نشہ کی گرفت میں تھے، کوئی چیز سجھائی نہیں دے رہی تھی ایسے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھا۔ غالباً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پہچانا، دھندلا دھندلا خاکہ حضرت علیؓ اور حضرت زید کا نظر آیا تو کہہ دیا کہ تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔ بخاری شریف میں اس کے بعد کا ماجرا مذکور نہیں ہے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جب حضرت حمزہؓ کو آپ کی آمد کا پتہ چلا ہوگا تو آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی چاہی ہوگی اور حضرت علیؓ سے بھی اس بارے میں گفتگو کی ہوگی۔

**آپ کے اہل وعیال:** اس کی تفصیل بحوالہ سیر الصحابہ اس طرح ہے۔ حضرت حمزہؓ نے متعدد شادیاں کیں، بیویوں کے نام یہ ہیں بنت الملہ ،خولہ بنت قیس، سلمی بن عمیس، ان میں سے ہر ایک کے بطن سے اولاد ہوئی، لڑکوں کے نام یہ ہیں: ابویعلی، عامر، عمارہ، آخر الذکر دونوں لاولد فوت ہوئے، ابویعلی سے چند اولادیں ہوئیں لیکن وہ سب بچپن ہی میں قضا کر گئیں، اس طرح حضرت حمزہؓ کا سلسلۂ نسل شروع ہی میں منقطع ہوگیا۔

سلمی بنت عمیس کے بطن سے اُمامہ نام ایک لڑکی بھی تھی ، فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ نے مراجعت فرمائی تو بھائی بھائی کہہ کر اس نے پیچھا کیا، حضرت حمزہؓ کے رشتہ داروں میں سے حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ نے ان کو اپنی اپنی تربیت میں لینے کا دعویٰ پیش کیا۔ لیکن آپ نے حضرت جعفرؓ کے حق میں فیصلہ دیا کیوں کہ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس امامہ کی حقیقی خالہ تھیں، آپؐ نے فرمایا کہ خالہ ماں کے قائم مقام ہوتی ہے حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ کو امامہ سے شادی کر لینے کی ترغیب دی تھی، لیکن آپ نے انکار کردیا اور فرمایا حمزہؓ میرے رضاعی بھائی تھے۔ (۳۳)

بہر حال حاصل کلام یہ کہ یہ چند معروضات حضرت حمزہؓ پر تحقیقی نکتہ نظر سے راقم نے پیش

کیے ہیں، امید ہے کہ اہل علم واصحاب ذوق اس پر مزید گفتگو فرمائیں گے۔

## ماخذ

(۱) علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی حصہ اول، مطبع معارف دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، پندرھواں ایڈیشن، ۱۳۹۷ھ۔ ص ۱۶۸۔ (۲) مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، الرحیق المختوم، حلیم بک ڈپو، نئی دہلی ۲، ۱۴۱۸، ص ۸۳۔ (۳) ایضاً، ص ۸۴۔ (۴) مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ، مترجم محمد احسان الحق لاہور، حیات الصحابہ حصہ اول، بحوالہ "مستدرک حاکم، و (میزان الاعتدال) حافظ ذہبیؒ" یاسین بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۷۔ (۵) علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، الاصابہ فی تمیز الصحابہ، جلد دوم، دارالکتب العلمیہ، بیروت (لبنان) ۱۴۱۵ء، ص ۱۰۶۔ (۶) امام بغویؒ، معجم الصحابہ جلد دوم، مکتب دارالبیان، کویت، ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۰۰۰ء۔ ص ۴۔ (۷) علامہ احمد بن علی بن حجر عسقلانیؒ فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دارالمعرفۃ، بیروت ۱۳۷۹ء، ص ۳۱۲۔ (۸) سیرت النبی حصہ اول، ص ۲۲۳۔ (۹) الرحیق المختوم۔ ص ۱۵۷۔ (۱۰) ایضاً، ص ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۳۵۔ (۱۱) سیرت النبی حصہ اول، ص ۳۲۳۔ (۱۲) حیات الصحابۃ حصہ اول، بحوالہ مسند بزاز۔ ص ۱۰۷۔ (۱۳) مولانا حاجی معین الدین ندوی، مہاجرین جلد اول، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔ (۱۴) سیر الصحابہ، جلد دوم۔ ص ۱۹۱۔ (۱۵) سیرت النبیؐ حصہ اول۔ ص ۳۸۲۔ (۱۶) ایضاً، ص ۳۷۳۔ (۱۷) الرحیق المختوم، ص ۳۹۰۔ (۱۸) ایضاً، ص ۴۰۲۔ (۱۹) سیر الصحابہ جلد دوم، ص ۱۹۲۔ (۲۰) الرحیق المختوم، ص ۴۰۶۔ (۲۱) حیاۃ الصحابہ حصہ اول، ص ۲۰۷۔ (۲۲) الرحیق المختوم، ص ۴۳۸۔ (۲۳) سیر الصحابہ جلد دوم، ص ۱۹۳۔ (۲۴) سیرت النبیؐ حصہ اول، ص ۳۸۷۔ (۲۵) الرحیق المختوم، ص ۳۸۹۔ (۲۶) سیرت النبیؐ حصہ اول، بحوالہ بخاری، غزوۂ احد، ص ۳۸۲۔ (۲۷) سیر الصحابہ حصہ دوم، ص ۱۹۲۔ (۲۸) علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی، مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت، حصہ اول، الرحمٰن پبلی کیشن ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی، طبع پنجم ۱۹۹۳ء، ص ۲۵۰۔ (۲۹) ایضاً، ص ۹۲، ۹۳، ۹۴۔ (۳۰) الامام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، الجزء الاول، کتاب المغازی، دار المعرفۃ، بیروت (لبنان)، ۱۳۷۹ھ، ص ۳۱۶۔ (۳۱) سیرت النبیؐ جلد چہارم، ص ۲۸۳۔ (۳۲) سیر الصحابہ جلد دوم، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ سیرت النبی حصہ اول، ص ۵۰۴۔

# اخبار علمیہ

## ''اسپینیوں میں اسلام کی مقبولیت''

اسپین کے قومی انسٹی ٹیوٹ برائے آبادی اور جمعیۃ المسلمین کی جائزہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ملکی سطح پر اسلام قبول کرنے والوں میں ۴۰ فیصد ملک کے اصلی باشندے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تعداد کٹالونیا میں آباد ہے۔ یہ تعداد مقامی آبادی میں ۲ء۷ فیصد ہے جو فرانس اور بلجیم میں آباد مسلمانوں کی آبادی کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ اسپین کے روزنامہ کرانیکل ''ڈیجیٹل'' کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ اسپین میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد فرانس میں قبول اسلام کرنے والوں کے برابر ہے۔ گذشتہ پانچ برس میں صرف کٹالونیا میں سات ہزار افراد اسلام کے سایۂ عاطفت میں آئے جن میں ہر دس میں سات افراد اسپین کے اصلی باشندے ہیں۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، دسمبر ۲۰۱۵ء)

---

## ''ترکی ریلیف کا مستحسن قدم''

رفاہی کام کرنے والی ''ترکی ریلیف'' ترکی حکومت کے زیر نگرانی کام کرنے والی ایک تنظیم دنیا کے ان ۵۴ ممالک کے ۷۰ ہزار یتیم بچوں کی عمدہ رہائش، خورد و نوش، تعلیم و تعلم اور دیگر ضروریات کی تکمیل کا فریضہ بہ حسن و خوبی انجام دے رہی ہے جو جنگ و فساد یا قدرتی آلام و مصائب کا شکار ہیں۔ انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اس میدان میں عیسائی تنظیمیں بہت آگے ہیں۔ یوگینڈا کے اکثر مسلمان بچے ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ اکثر ذہین بچے ان کے ذریعہ مغربی ممالک بھیج دیے جاتے ہیں جہاں وہ عیسائی خاندانوں کے زیر کفالت پرورش پاتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس وقت دنیا میں ۴۰۰ ملین یتیم بچے ہیں جن میں ۴ ملین بچوں کی کفالت صرف ایک عیسائی تنظیم کر رہی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان بچوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، دسمبر ۲۰۱۵ء)

---

## ''برطانوی نوجوانوں کی ریاضی اور انگریزی میں مہارت پر ایک رپورٹ''

او ای سی ڈی یعنی اقتصادی تعاون و ترقی کی تنظیم کی طرف سے کرائی جانے والی ایک تحقیقی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۲۳ ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں برطانوی نوجوانوں کی شرح خواندگی

سب سے کم ہے۔اس فہرست میں ۱۶ سے ۱۹ برس کے برطانوی نوجوانوں کی درجہ بندی انگریزی کے لیے آخری نمبر اور ریاضی کے لیے آخری نمبر سے ایک درجہ اوپر ہے۔رپورٹ میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ برطانیہ میں ۹۰ لاکھ کام کرنے والی آبادی انگریزی اور ریاضی کی صرف بنیادی قابلیت رکھتی ہے۔ جائزے کے مطابق ۲۰ سے ۳۴ سال کے ۷ فیصد گریجویٹ افراد کی ریاضی کی مہارت کی سطح ۲ یا چھٹی جماعت کی قابلیت کے برابر اور ۴ء۳ فیصد گریجویٹس کی انگریزی مہارت کی سطح اس سے بھی نیچے ہے۔(تفصیلات راشٹریہ سہارا، ۲ر فروری ۲۰۱۶ء میں ملاحظہ کی جائیں)

---

## ”خلوت گزینی مضر صحت ہے“

ایک نئے مطالعہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ تنہا رہنے سے انسانی خلیات کی سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔جو مختلف امراض کی وجہ بنتی ہیں اور اس سے اوسط زندگی پر منفی اثر پڑتا ہے۔رپورٹ کے مطابق تنہا رہنے سے جسم کے سفید خلیات کی تعداد پر اثر پڑتا ہے اور وہ جسم کے اندر قدرتی طور پر لڑنے والے امنیاتی نظام کو کمزور کرتے ہیں اور انسان بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ ماہرین نے مطالعہ کے لیے ۱۴۱ سن رسیدہ افراد کا انتخاب کیا جن میں کچھ کو تنہا اور کچھ کو معاشرہ کے ساتھ رہنا پسند تھا۔مطالعہ سے معلوم ہوا تنہائی پسندوں میں سوزش اور جلن کی شدت زیادہ تھی جس کے سبب ان کی صحت پر برے اثرات مرتب ہورہے تھے۔ماہرین نے تنہائی پسندی کو صرف بوڑھوں کے لیے ہی نقصان دہ نہیں بتایا بلکہ نوجوانوں کو بھی تنہائی سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔(نیا اخبار، لاہور، ۲۱ر جنوری ۲۰۱۶ء)

---

## ”قدیم ترین انسانی قتل عام کی دریافت“

شمالی کینیا میں ماہرین آثار قدیمہ کو انسانوں کے درمیان قدیم ترین جنگ کے شواہد ملے ہیں۔ان کے مطابق کینیا کے شمال میں واقع ترکانا جھیل کے قریب دس ہزار سال قبل ایک جنگ ہوئی۔ ۲۷ر افراد کی یہ باقیات اسی عہد کی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ان کی موت تشدد کی وجہ سے ہوئی۔دفن کرنے کے بجائے انہیں کھلے عام چھوڑ دیا گیا تھا۔متعدد ماہرین نے دلیل دی ہے کہ اس قسم کی جنگیں

صرف اسی وقت ممکن ہیں جب انسانوں نے بستیاں بسانا شروع کردیا تھا۔اس علاقہ میں ماہرین ۲۰۱۲ء سے کھدائی کے کام میں مصروف ہیں۔ان کا بیان ہے کہ متاثرہ افراد کو ڈنڈوں سے مار کر اور گھونپ کر ہلاک کیا گیا تھا۔مہلوکین میں مرد،عورت اور بچے سب شامل ہیں،انہیں مخالف مسلح شکاریوں یا جنگ جویوں نے لکڑیوں اور تیروں سے ہلاک کیا جن کے سروں پر تیز دھار پتھر لگے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں میں انسانوں نے دھاتیں دریافت نہیں کی تھیں۔(بی بی سی اردو ڈاٹ کام،۲۱/جنوری ۲۰۱۶ء،بحوالہ نیچر)

---

## ''مکہ میں مذہب اور اسلامی یادگاروں سے متصل سینما ہال کا قیام''

مکہ مکرمہ میں مذہبی اور اسلامی یادگاروں مثلاً جبل ثور،جبل نور،مقام ولادت نبویؐ،بئر طویٰ وغیرہ کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ان یادگاروں سے متصل سینما ہاؤس بنائے جائیں۔اس کا مقصد مذہبی یادگاروں کی زیارت سے قبل اس سے متعلق زائرین کو تاریخی معلومات کی فراہمی اور ان کے وجود کے پس منظر سے واقف کرانا اور ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہے کہ ان یادگاروں سے متعلق کون سے اعمال شرعاً جائز یا ممنوع ہیں۔ان یادگاروں کے علاوہ سیرت طیبہ سے متعلق دیگر ویڈیوز بھی دکھائے جائیں۔اسلامی آثار اور آنحضورؐ کی سیرت اور تعلیمات سے واقف کرانے کا یہ انداز یقیناً موثر،دلچسپ اور نہایت مفید طلب ہوگا۔اس ضمن میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ مخصوص دینی اداروں کو اس کی نگرانی پر مامور کیا جائے۔جو پیش کی جانے والی معلومات کے استناد و صداقت کا خاص اہتمام کریں۔ام القریٰ یونیورسٹی،مکہ میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر فؤاد الدباس نے جامعہ شاہ عبداللہ برائے سائنس وٹکنالوجی میں کیے جانے والے اس کے تجربہ پر روشنی ڈالی جہاں ایسے سینما ہال تعمیر کیے ہیں جن میں اعلیٰ ٹکنالوجی کے مناظر اور بعض اہم مقامات سے متعلق دستاویزی تاریخی معلومات پیش کی جاتی ہیں اور جو زائرین حج کے لیے خاص طور پر کشش کا باعث بنتی ہیں۔(العربیہ ڈاٹ نٹ،۲۳/ جنوری ۲۰۱۶ء،بحوالہ روزنامہ''مکہ'')

ک،ص اصلاحی

# معارف کی ڈاک

## املا

فلیٹ نمبر ۳۰۱،
امتیاز ریزی ڈنسی نیو ملے پلی
حیدرآباد
۲۶۔۱۰۔۳۳

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حسن ظن ہے معارف سے کہ اس کی زبان مثالی ہوتی ہے یعنی ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ لیکن حیرت ہوئی یہ دیکھ کر (اگست کے شمارے میں) کہ گزشتہ کو گذشتہ لکھا گیا ہے (یہ غلطی خواص میں بھی اس قدر درآئی ہے کہ اب لغت میں اس کو شامل کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے یعنی ع خود بدلتے نہیں فرہنگ بدل دیتے ہیں)۔ اور یہ M.A کو بلا تکلف ایم۔ اے لکھا جا رہا ہے حالانکہ ایم تو aim ہے۔ اسی طرح B.Ed کو بی۔ ایڈ لکھنا۔ ارے بھائی ایڈ تو aid ہے۔ اب کہاں تک گنوائیں۔ البتہ ایک فاش غلطی کو جس کا تعلق اسلامیات سے ہے بیان کرنا لازمی ہے۔ محمدؐ میں م معروف ہے نہ کہ مجہول۔ اس لیے اس کو Mu لکھنا چاہیے نہ کہ Mo۔ قرآن کا املا بھی گمراہ کن ہے۔

Quran تو قران ہے اور Quraan قراان ہے (دو الف کے ساتھ)۔ صحیح املا ہوگا Qur'aan۔ قرآن۔ حدیث کو Hadith لکھا جا رہا ہے۔ کروڑوں ہندوستانی th کو تھ پڑھتے ہیں ث نہیں۔ رمضان کو Ramadhan یا Ramadan لکھ رہے ہیں، اس کو ہندوستانی زبانیں بولنے والے رمدھان/رمدان پڑھیں گے؟ آج کل حدیث کو Hadis بھی لکھ رہے ہیں۔ یہ تو حادثہ ہوا؟ حدیث کو تو Hadees لکھنا چاہیے۔ یہ سب مستشرقین کی کارستنیاں (؟) ہیں۔

ہاں۔ ایک چیز اور (محمد) صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے Peace be upon him کا رواج

ہے۔ارے بھائی۔یہ تو علیہ السلام کا ترجمہ ہوا۔صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو Benediction/ Blessing&Peacebeuponhim ہونا چاہیے۔یہ غلطیاں صدیوں سے چلی آرہی ہیں آخر کب تک؟ ع بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

یعنی پریشان کن عربی حروف کو انگریزی میں کچھ اس طرح لکھیں:

ذ۔z/ ز۔ż/ض۔z̄/ ظ۔z̿/س۔s / ث۔ṡ/ص۔s̄۔اس

غرض کے لیے عالمی اداروں کے ناخداؤں کو متوجہ کرنا ہوگا۔

ع　تری بزم میں ناز کی بات کہہ دی

ذرا بے ادب ہوں دعا چاہتا ہوں

(نوٹ: درجن بھر کتابوں کے مصنف، ہمدرد کے حکیم محمد سعید شہید صحیح کو صحی اور تصحیح کو تصحی لکھتے تھے۔اردو املا کو آسان کرنے کی طرف یہ ایک اچھا قدم ہے)

دو ماہ گزر گئے کہ میں نے اپنی تالیف ''کلام اقبال: موضوعاتی ترتیب'' ذریعہ رجسٹری ارسال کی تھی۔کیا نہیں ملی؟ اور گزارش صرف تعارف ہی کی کی تھی کیوں کہ ع تبصرہ دیر طلب اور تمنا بے تاب۔ لیکن حیرت ہے کہ رسید کتاب میں بھی اس کا ذکر نہیں ہوا؟؟ اور اب اقبال کی نظمیں اور اقبال کے ۳۱۳ اشعار یعنی اقبال میڈ ایزی ارسال خدمت ہیں۔

اور فرزندم سید عبدالماجد غوری (اُس وقت مقیم دمشق اور اس وقت مقیم کوالالمپور) نے اپنی تالیفات رتصنیفات آپ کی خدمت میں بالمشافہ پیش کی تھیں ان پر بھی آج تک نہ تبصرہ ہوا اور نہ.....ہاں ایک کتاب رسید کتب کے تحت درج نظر آئی تھی! رہے نام اللہ کا۔

بہر حال مخلص

(جناب) ابن غوری

# شاہ عطا، حرف آخر

ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری
یونیورسٹی آف دلی
دلی۔۱۱۰۰۰۷

استاذ مکرم جناب پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب دام مجدکم
امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

میرا یہ مراسلہ معارف میں شائع ہوئے ایک تعزیت اور اس کے متعلق مراسلات کی وضاحت میں ہے۔ امید کہ اس کو شامل کر کے قارئین میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ ضرور فرمائیں گے۔ اگست ۲۰۱۵ء میں معارف میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ تعزیتی تحریر برائے مولانا شاہ محمد شبیر عطا صاحب مرحوم اور اس کے بعد ڈاکٹر محمود حسن صاحب الہٰ آبادی کا مراسلہ برائے مرحوم، اس کے بعد جواباً پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی اور مولانا ظفر الیقین صاحبان کے وضاحتی مکاتیب شائع ہو چکے ہیں، جس کے بعد خاصی حد تک جناب محمود حسن صاحب کی معلومات و اطلاعات پر گرفت ہوگئی۔ لیکن دوبارہ پھر محمود حسن کا مراسلہ! گویا اپنی غلط بیانی پر اصرار۔ اس سلسلہ میں ذیل کی وضاحت ضروری ہے:

حضرت مولانا شاہ محمد نعیم عطا صاحب محدث (شاگرد شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی) سجادہ نشین ہشتم خانقاہ کریمیہ سلون کا انتقال ۱۵؍جنوری ۱۹۶۶ء کو سلون میں ہوا، وہ آخر عمر تک سجادہ نشین اور متولی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے نامزد کردہ خواہر زادے سید شاہ محمد حسین جعفری صاحب کی مسند نشینی عمل میں آئی۔ اس مسند نشینی کے خلاف شاہ شبیر عطا صاحب اور شاہ فرید عطا صاحب نے سنی سنٹرل وقف بورڈ میں عذر داری داخل کی۔ یہ سلسلہ عدالت دیوانی سے ہوتا ہوا ہائی کورٹ اور پھر

سپریم کورٹ تک جا پہنچا۔ کسی بھی مرحلہ میں شاہ شبیر عطا صاحب کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ عدالت عالیہ سے سید شاہ محمد حسین جعفری مرحوم مغفور اور ان کے بعد ان کے نامزد سید شاہ احمد حسین جعفری اصلاحی خانقاہ کریمیہ سلون کو سجادہ نشین اور متولی تسلیم کیا گیا۔ شاہ شبیر عطا صاحب پر حکم امتناعی بھی نافذ رہا۔ لہٰذا مرحوم کا خانقاہ کی سجادگی یا تولیت سے رشتہ جوڑنا غلط بیانی ہے۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مرحوم الحاج شفیق الرحمٰن صاحب اور ظفریاب جیلانی صاحب اس مقدمے میں مرحوم شاہ محمد حسین جعفری صاحب کی طرف سے پیروی کر رہے تھے۔

شاہ حسن عطا صاحب مرحوم کی جس تقریر کا حوالہ محمود حسن صاحب نے دیا ہے، اس کی وضاحت پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی بہت احسن انداز میں کر چکے ہیں۔ اس کی تفصیل سید الطاف احمد بریلوی صاحب رسالہ العلم کراچی (جولائی ۱۹۸۱ء) میں بھی نہایت صراحت سے کر چکے ہیں، جس میں ترجمان القرآن کا حوالہ تک نہیں ہے۔

شاہ شبیر عطا صاحب کا احترام خانوادہ کریمیہ کے ممتاز فرد کے طور پر سلون کے اطراف و جوانب میں اور خانوادہ سے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ رہا۔ ان کی نماز جنازہ اور تدفین کے موقع پر ہزاروں افراد موجود تھے۔

فقط والسلام وطالب خیر

سید ظہیر حسین جعفری

# مکتوب حیدرآباد

کاچی گوڑہ، ریلوے اسٹیشن

حیدرآباد، تلنگانہ

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ۲۹/جنوری کو میں نے اپنی پانچویں کتاب جو حسن چشتی صاحب نے ریلیز کی تھی بک پوسٹ سے روانہ کردی۔ ایک مختصر سی تحریر بھی منسلک ہے۔ پڑھ لیجیے گا۔

اکثر مضامین پر مجھے بہت خوب، بہت خوب اور کلمات تحسین ملے لیکن سچائی یہ ہے کہ جتنی تعریف وتوصیف مجھ کو حالیہ اس مضمون سے ملی کبھی بھی کسی مضمون سے نصیب نہیں ہوئی۔ پانچویں کتاب کا انتساب پڑھ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے اس کتاب کو ان قدردانوں، بہی خواہوں کے نام کردیا ہے جنھوں نے میرے قدم اس ادبی میدان میں رکھوا دیے۔ بھلا میں مولوی قمرالدین صابری (مکتبہ شاداب)، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (مخدوم کے رفیق) اور ڈاکٹر منان مرحوم کو کیسے بھول سکتا ہوں؟؟ جب کبھی کسی دعوت میں، کسی ادبی محفل میں آمنا سامنا ہوجاتا تو پوچھتے "دوسری کتاب کب آرہی ہے جناب" میرے ان محسنوں کو نہ میں بھول سکتا ہوں نہ مرتے دم تک بھولوں گا۔

بیف پر ہورہی سیاست پر میں نے دو فکر انگیز مضمون لکھے ہیں جو شکر ہے بہت مقبول ہوئے۔ اس میں درج بہت سے حقائق ہیں جن کا V.H.P اور کٹّر ہندو بھی انکار نہیں کرسکتے۔ جو چنگاری سلگ کر آگ بن گئی تھی غالباً اب قدرے بجھ رہی ہے۔ مضمون کی زیراکس کاپی منسلک ہے۔

مضمون نگاری کے لیے حوصلے بلند کرنے والوں کے نام تو یاد رہے لیکن میں اپنے استاد محترم (منٹو سرکل، علی گڑھ) کا نام کیونکر بھول گیا۔ عمر کے اس حصے میں ہوں جو بہت کچھ بھلا دیتا ہے۔ کبھی اشعار، کبھی تسلسل بیان، کبھی "نے" کا استعمال!! ہاں! اب یاد آگیا۔ میرے محترم استاد وارڈن کا نام محمد عزیز الحسن انصاری ہے۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ عرصۂ دراز تک ان سے خط وکتابت تھی۔ اب کچھ عرصہ سے خیر خبر نہیں۔ نا آپ اکیلے ہیں اور نہ میں تنہا ہوں۔ ہم اپنی تحریر سے انقلاب ضرور لائیں گے۔ اس شعر پر میں تحریر ختم کرتا ہوں ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

فقط۔ خلوص کیش

(جناب) عباس سکندر انصاری

## وفیات

# جمیل الدین عالی

### ۲۰؍جنوری ۱۹۲۵ء۔۲۳؍نومبر ۲۰۱۵ء

جناب ابوالحسنات*

ترجمہ: جناب محمد طارق غازی**

کیوں بجھ گئے ہو ، آتشِ پنہاں کو کیا ہوا
عالی تمہارے سوز دل و جاں کو کیا ہوا

جمیل الدین عالی، جنہیں لوگ پیار سے عالی جی کہتے تھے، ایک عالی حوصلہ شخص تھے۔ انہیں ناموری اور حصول امتیاز کی بڑی لگن تھی۔ وہ ایک معمہ تھے۔ ان کی شخصیت مجموعہ اضداد تھی۔ زندگی نے انہیں مایوس نہیں کیا اور بہت کچھ عطا کیا۔ وہ ایک کامیاب اور مشہور شاعر و ادیب تھے۔ مگر پھر بھی غیر مطمئن اور ایک داخلی کرب کا شکار رہتے۔ انہیں ڈر رہتا تھا کہ کہیں انہیں بھلا نہ دیا جائے۔

دوشنبہ ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء کو ۹۰ سال کی عمر میں کراچی پاکستان، میں مختصر علالت کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

عالی جی کی پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو دہلی میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام نواب زادہ مرزا جمیل الدین احمد خان تھا۔ ان کی بچپن کی یادیں کچھ خوشگوار نہ تھیں۔ ان کی والدہ خواجہ میر درد کی اولاد میں تھیں اور نواب لوہارو سر مرزا امیر الدین خان کی چوتھی بیوی تھیں۔ شمالی ہند میں لوہارو ایک نوابی ریاست تھی۔ دہلی کے مغرب میں موجودہ ریاست ہریانہ کے ضلع بھوانی میں نواب احمد بخش خان نے لوہارو سٹیٹ قائم کی تھی۔ عالی کی عمر بہ مشکل دس گیارہ سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور خاندان کا گزر بسر برطانوی راج سے ملنے والے معمولی وظیفہ پر منحصر رہ گیا۔

---

* کراچی۔

---

** ڈائریکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس (USH) ٹورانٹو، کینڈا۔

شاعری عالی کی پہلی محبت تھی۔ غالب کے زمانہ سے ان کا خاندان شعر گوئی کا ذوق رکھتا تھا۔ عالی کم عمری ہی میں شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے اپنا کلام داغ دہلوی کے داماد نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کو دکھایا اور ان سے رموز شاعری سیکھے۔ شروع میں غزل پر توجہ رہی لیکن بعد میں جب طیبہ بیگم سے محبت ہوئی تو ہندی شاعری کی صنف دوہے کی طرف متوجہ ہوئے۔ طیبہ بیگم سے ۱۹۴۴ میں ان کی شادی ہوگئی۔ اسی سال دہلی کے اینگلو عربک کالج سے انہوں نے گریجویشن کیا۔ اس وقت تک وہ شاعر کی حیثیت سے خاصے معروف ہو چکے تھے۔ تقسیم کے موقع پر ۱۳/اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے خاندان سمیت وہ پاکستان منتقل ہوگئے اور وزارت تجارت میں برسر کار ہوگئے۔ پھر ۱۹۵۱ء میں مرکزی اعلیٰ خدمات کا امتحان پاس کیا اور پاکستان ٹیکسیشن سروس میں افسر ہوگئے۔ ایوان صدارت میں ۱۹۵۹ سے ۱۹۶۳ تک افسر بہ کار خاص مقرر رہے۔ کچھ مدت وزارت تعلیم میں کاپی رائٹ کے رجسٹرار رہے پھر نیشنل پریس ٹرسٹ کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ آخرکار نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت کرلی اور رٹائر ہونے تک اسی سے منسلک رہے۔

اتنے طویل پیشہ ورانہ سفر کے باوجود ان کی روح مضطرب رہی۔ ان کی شاعری کا اعتراف بھی ہوا اور اسے پسند بھی کیا، عوامی مقبولیت بھی ملی مگر ان کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ وہ ہمیشہ مورد توجہ رہنا چاہتے تھے۔ اس پر مستزاد انہیں نزاعی معاملات میں الجھے رہنے کا شوق تھا۔ مگر فیلڈ مارشل ایوب خان کے مارشل لا دور کی ابتدا میں جس تنازعہ میں وہ الجھے تھے اس سے زندگی بھر انہیں چھٹکارا نہ ملا۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادارہ قائم کرنے کی تجویز رکھی جو بعد کو رائٹرز گلڈ کے نام سے قائم ہوا۔ مگر کچھ لوگوں نے اس ''ناپاک گناہ'' کے لیے انہیں زندگی بھر معاف نہ کیا۔ وہ لوگ اس تنقید میں متوازن نہ تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ جذباتی خط تقسیم کے دونوں طرف بے شمار مشہور و معروف شعراء اور ادباء نہ صرف اس ادارہ کے حق میں تھے بلکہ اس کے بانی اراکین بھی تھے۔ تاہم ناقدین کی رائے تھی کہ مارشل لا حکومت اس ''ادبی ٹریڈ یونین'' کو اپنے مفادات کی اشتہاری بازی گری کے لیے استعمال کرے گی۔ پھر جب ایوب خان کے صدارتی عملہ میں عالی افسر بہ کار خاص مقرر ہوئے تو گویا شبہات و اعتراضات کی تصدیق ہوگئی۔

تاہم یہ مخالفانہ مہم عالی کے جذبہ کو سرد نہ کرسکی۔ انہیں اپنے تمام مخالفین اور نقادوں کو نچلا بٹھا

دینے کا گُر آتا تھا۔اپنی خداداد اختراعی صلاحیت کی بنیاد پر انہوں نے ساری ادبی قوت جمع کی اور مخالفوں پر ثابت کردیا کہ وہ ناقابل شکست تھے۔

عالی نے بڑے بحرانی دور میں شاعری شروع کی تھی۔ان دنوں ترقی پسندی کا طوفان دنیائے ادب کو متاثر کررہا تھا اور اس کے حامی نظام کہنہ کو اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کررہے تھے۔ادیبوں اور شاعروں کی اس نئی کھیپ کے نزدیک قدیم ثقافتی،سماجی اور ادبی روایات بے معنی ہوچکی تھیں اور عہد نو کے مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر تھیں۔غزل جو قدیم معاشرتی اقدار کی علامت تھی ان ترقی پسندوں کا سب سے نمایاں ہدف تھی۔اس مہم کے ساتھ برطانوی راج کی سرپرستی میں الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کی چلائی ہوئی نئی شاعری کی تحریک کا نزلہ بھی غزل ہی پر گر رہا تھا۔عالی نے ان دونوں نظریوں اور تحریکوں کو یکسر مسترد کردیا اور غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنانے میں تکلف سے کام نہیں لیا۔اگرچہ انہوں نے روایتی پیرایہ بیان ترک نہیں کیا پھر بھی ان کی آواز کی تازگی لوگوں کو متوجہ کررہی تھی۔جلد ہی انہوں نے منفرد اسلوب،غنائیت اور خیال انگیز منظر کشی کی راہ سے اپنا مقام بنالیا۔کلاسیکی موسیقی کی سوجھ بوجھ اور خوبصورت نواگری کی بدولت مشاعروں میں وہ اپنے سامعین کو مسحور کردیتے تھے۔

البتہ ان کی ادبی توانائی اور تخلیقی صلاحیت کا بھرپور اظہار دوہے کی صنف میں ہوا۔ان کے شعری جذبات غزل سے زیادہ دوہوں میں ابھرتے ہیں۔باوجودیکہ دوہوں میں ان کے موضوعات میں جنسیت کا گہرا اثر ملتا ہے مگر وہ ابتذال کی سطح پر کبھی نہیں آئے۔اس صنف میں انہوں نے نئے تجربات کیے اور اسلوب بیان میں ندرت پیدا کی جسے وہ ''عالی چال'' کہتے تھے۔عالی نے ہندی دوہے کے سخت ضابطوں کو توڑ کر اور صدیوں پرانی ڈگر سے ہٹ کر اس صنف کی نئی موضوعاتی حد بندی کی اور اسے نیا ابھار دیا۔

عالی کی غزلیں اور دوہے اگرچہ ان کی خودنوشت سوانح کا حصہ ہیں،تاہم عصری مسائل اور تشویش کے اظہار کو بھی ان میں مناسب جگہ ملی ہے۔

ان کی جدت کاری کا بہترین نمونہ ان کی طویل نظم ''انسان'' ہے۔دس ہزار سے زیادہ مصرعوں اور سطروں پر مشتمل ہونے کے باوجود یہ نظم نامکمل ہے۔اس نظم کی ڈرامائیت اور تمثیل کاری کی جڑیں یونانی ڈرامے میں پیوست ہیں،اگرچہ یورپی ڈرامہ شاذ و نادر ہی اس اسلوب سے فائدہ اٹھاتا

ہے، جبکہ اردو ادب میں یہ صنف سرے سے مفقود ہے۔ڈرامے کے اسلوب میں تخلیق کی گئی نظم ''انسان'' فصلوں (acts) اور غنائیوں (cantos) میں تقسیم ہے جن کے امتزاج سے ایک موضوعاتی اور عبارتی تواتر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نظم بلاشبہ زندگی اور معاشرہ کے مختلف کرداروں کے مابین مکالمہ، یکالمہ، خودکلامی، مناجات، اور بیانیہ تکنیکوں میں اظہار کا ایک نادر مرقع ہے۔

عالی نے گیت بھی لکھے ہیں اور ان کے چند قومی گیتوں کو تو دوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ان میں وہ ترانہ بھی شامل ہے جو انہوں نے ۱۹۷۴ء کی لاہور اسلامی چوٹی کانفرنس کے موقع پر لکھا تھا۔جیوے جیوے پاکستان ان کا ایک مقبول عام گیت ہے۔ایک صنف ادب کے طور پر عالی کے گیت بھی غیر روایتی اور غنائیت، گیت اور تال کی خوبیوں سے مملو ہیں۔

نثر بھی وہ بے تکان لکھتے تھے۔انجمن ترقی اردو کی مطبوعات پر ان کے سینکڑوں پیش لفظ، نیز وہ سفر نامے جو روزنامہ جنگ کراچی میں قسط وار شائع ہوتے تھے تین جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء سے ۲۰۱۰ء کے دوران وہ روزنامہ جنگ ہی میں پابندی سے ہفتہ وار اظہاریے لکھتے رہے۔البتہ نظم کے مقابلہ میں انہوں نے نثر میں کوئی قابل ذکر کام نہیں چھوڑا۔ان کی زیادہ تر نثری تحریریں ہنگامی اخباری نوعیت کی ہیں پھر بھی ان کے لکھے ہوئے چند پیش لفظ ان کی ادبی دقت نظر کے نمونے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ اگر نثر میں وہ زیادہ سنجیدہ ہوتے تو کہیں بہتر ذخیرہ چھوڑ سکتے تھے۔سائل دہلوی پر ان کا مقالہ ایک عمدہ ادبی تحریر اور اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔

ان کی زندگی کا ایک رخ تعلیمات، ادب اور زبان کے میدانوں میں اداروں کا قیام ہے اور ان کی فعالیت اور سرگرمی کی ایک مستقل داستان ہے۔جب معاملہ اردو اور پاکستان کا ہوتا تو کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔شکست کھانا ان کے مزاج میں نہیں تھا خواہ اس کے لیے کیسی ہی مخالفت کیوں نہ مول لینی پڑے۔مگر ان کا کمال یہ تھا کہ نتیجہ وہی نکلتا جو وہ چاہتے تھے۔

انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی جانشینی پر بڑا فخر تھا۔بابائے اردو کے ارادوں کی تکمیل ان کا مقصد حیات تھا۔یہ بھی عالی کی زندگی کا ایک تکلیف دہ دور تھا جب وہ ان تمام ارباب اقتدار سے جنگ آزما رہے جو بابائے اردو کو نظر انداز کرنے اور اردو کو اس کے قومی تشخص سے محروم کرنے کے درپے تھے۔کس طرح انہوں نے ۱۹۷۲ء میں اردو کالج کی بقا کی لڑائی لڑی اور بعد میں کیسے اسے

یونیورسٹی کا درجہ دلوایا وہ بھی ایک مستقل داستان اور ایک جدا مقالہ کا موضوع ہے۔

انجمن ترقی اردو دوسرا ادارہ ہے جو عالی کے بغیر نہ جانے کب اپنی موت مرجاتا۔ مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد ۱۹۶۲ء میں عالی نے انجمن کے اعزازی معتمد کی ذمہ داری قبول کی اور وہ سب کچھ کرگزرے جو اس کی بقا اور نمو کے لیے انسانی سطح پر ممکن تھا۔ اس معاملہ میں بھی وہ ایک ایسا نیا تنازعہ چھوڑ گئے جو موت کے بعد بھی ان کا پیچھا کرتا رہے گا۔ انتقال سے پہلے ایک ''وصیت'' کے مطابق انجمن کی باگ ڈور انہوں نے اپنے بیٹے کے سپرد کردی ہے۔

ترقی اردو بورڈ کے ماتحت اردو لغت کے منصوبہ کو داخل دفتر ہونے سے بچانے کا سہرا بھی بڑی حد تک عالی کے سر ہے۔ برسوں کی انتھک محنت کے بعد بائیس جلدوں میں مرتب کی جانے والی اردو لغت ان کی زندگی ہی شائع ہوگئی تھی۔

عالی کی زندگی کا ایک معمہ یہ ہے کہ وہ راہ بھٹک کر عملی سیاست میں کیوں داخل ہوئے تھے۔ کہہ نہیں سکتے کہ یہ ان کی مضطرب شخصیت کا ایک اضافی پہلو تھا یا ایک نئے بام شہرت پر پہنچنے کی سعی یا کچھ اور تقاضے جنہیں وہ آسانی سے رد کر سکتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس سمندر میں اترنا نہیں چاہتے تھے جس کی گہرائی کا انہیں کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس معاملہ میں وہ کسی سوال کا جواب دینے کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں جماعت اسلامی کے منور حسن کے مقابلہ میں پیپلز پارٹی کے امیدوار کے طور قومی اسمبلی کا الیکشن ہارا تھا۔ دوسری بار ۱۹۹۷ء میں متحدہ قومی موومنٹ کے نمایندہ کی حیثیت سے سینٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

یہ تمام کامیابیاں، یہ سارے تمغے، یہ اتنے بہت گلہائے عزت عالی کی مضطرب شخصیت کے لیے گویا ناکافی تھے۔ کچھ اور کرنے، کچھ اور بنانے، کچھ اور حاصل کرنے اور دنیا کو کچھ اور دینے کی خواہش ان کے جسم و جان کو مستقل متحرک رکھتی تھی۔ اسی لیے وہ ہمیشہ بے اطمینانی اور بے سکونی محسوس کرتے رہے۔ انہی کے الفاظ میں:

جیون آنچ نے کیا بخشا اک سچے سر کی پیاس
وہ سچا سر لگا نہیں اور عالی گئے اداس

# جناب ایم اے مجید مرحوم
## (۱۹۲۱-۲۰۱۶)

افسوس کہ ۳؍جنوری کو جناب ایم، اے عبدالمجید بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب شاید کم ہی ان کی شخصیت اور ان کے وجود کی اہمیت سے واقف ہیں، لیکن انہوں نے جس طرح کلکتہ میں ایران سوسائٹی کے ذریعہ فارسی اور اردو ادب بلکہ تہذیب وثقافت کی آبیاری کی اور جب تک عزم وحوصلہ کی سکت رہی خود کو ایک بڑے مقصد کے لیے گویا تج دیا، وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

۱۹۲۱ میں بہار میں پیدا ہوئے لیکن عمر کا سارا سرمایہ انہوں نے کلکتہ کے نام کر دیا۔ پچانوے سال کی اس زندگی میں والد کے دست شفقت کی نرمی وگرمی صرف پانچ سال کے لیے مقدر ہوئی، باقی نوے سال وہ کشمکش زندگی کے ہر سرد وگرم سے گزرتے رہے۔ مدرسہ عالیہ کی تعلیم نے غالباً فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مہمیز کیا، سرکاری ملازمت کی لیکن فارسی زبان وادب سے تعلق برقرار رہا جو ایران سوسائٹی آتے آتے عشق وعقیدت میں بدل گیا۔

اب تو ایران سوسائٹی بھی زمانہ کے مدوجزر کا نمونہ ہوگئی ہے ورنہ کلکتہ کی علمی دنیا کی وہ سب سے خوبصورت شناخت بلکہ آبرو تھی۔ ۴۴ء میں جب وہ قائم ہوئی تو چند برسوں میں ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے اپنے جذبہ اخلاص سے اس کی بنیادوں کو ایسا استحکام بخشا کہ زبانوں پر یہ اعتراف عام ہوا کہ یہ سوسائٹی ہندوستان کے علمی حلقوں کے لیے ایک مثال ہے۔ فارسی کے مشاہیر پر جیسی کتابیں اور جیسے علمی جشن سوسائٹی نے آراستہ کیے ان کو دیکھ کر شیراز وصفاہان کے خیاباں بھی کھل اٹھے۔ رسالہ انڈو ایرانیکا فارسی ادب کا معتبر ترین مجلہ بن گیا۔ سوسائٹی کی اس شہرت ووقعت میں ڈاکٹر اسحاق مرحوم کو جن دو مخلص ترین رفیقوں کا تعاون ملا، ان میں ایک خواجہ محمد یوسف تھے، اس بزم دوشیں کی دوسری شمع ایم اے مجید تھے، جو مشکل ترین حالات میں اپنی روشنی بکھیرتے رہے۔

دارالمصنّفین سے ان کو محبت تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے بھی اس محبت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ برابر اس کے مقتدر سمیناروں میں شریک ہوتے۔ خواجہ محمد یوسف کو انہوں نے دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ میں شامل کیا، مجید صاحب کی وہ مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ درازیٔ عمر نے مجید صاحب کے قویٰ ضرور مضمحل کیے لیکن جذبوں کی قوت میں کمی نہیں کی، چند ماہ پہلے ایران سوسائٹی نے

علامہ شبلی پر ایک سمینار کا اعلان کیا، خیال تھا کہ اس موقع پر ان کی زیارت ہوگی لیکن جناب ہاشم عبدالحلیم سرپرست ایران سوسائٹی کے انتقال کی وجہ سے سمینار کو ملتوی کردیا گیا اور اب وہ روح رواں بھی نہیں جس سے سوسائٹی میں زندگی تھی۔ڈاکٹر اسحاق مرحوم کے انتقال پر سید صباح الدین صاحب نے لکھا تھا کہ ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو خواجہ صاحب اور مجید صاحب اسی لگن اور دھن سے انجام دیتے رہیں گے۔دعا ہے کہ جناب منصور عالم کے ذریعہ سوسائٹی ایک بار پھر اپنی عظمت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو اور ایم اے مجید صاحب کی روح بھی شاداں ہو۔

## جناب عبدالرحیم قریشی
(۱۹۳۵-۲۰۱۶)

ملک وملت کے لیے ایک اور بڑا سانحہ، جناب عبدالرحیم قریشی کا جانا ہے۔مسائل ومصائب کم نہیں، ایسے میں قریشی صاحب جیسے مخلص مدبر اور دردمند وفکر مند کا رخصت ہوجانا بڑی آزمائش ہے۔۳۵ء میں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اور ۱۴/ جنوری ۲۰۱۶ء میں آنکھیں موندلیں، گویا اکیاسی سال کی عمر پائی۔اس عمر مستعار میں دیکھا جائے تو قریب چہتر سال انہوں نے ملت کی تعمیر میں بسر کردیے۔حیدرآباد میں تعلیم کے دوران ہی وہ ملی مسائل سے وابستہ ہوئے۔تعلیم انہوں نے اعلیٰ حاصل کی۔ریاضی ان کا خاص مضمون رہا۔قانون میں بھی ڈگری لی۔اچھی ملازمت بھی کی لیکن مجلس تعمیر ملت اور اس کے نیک نام بانی سید خلیل اللہ حسینی کی نہایت فعال شخصیت کے سایہ میں انہوں نے اپنی زندگی کا رخ اور مقصد متعین کیا اور یہ صاف تھا یعنی ہندوستان میں ملت کے درد کا درماں، مسلم پرسنل لا بورڈ ان کے فکروعمل کا سب سے بڑا مظہر ثابت ہوا، وہ شروع سے اس سے وابستہ ہوئے اور آخر تک اس کے سکریٹری کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے۔ان کی معاملہ فہمی، دوراندیشی پر سب کا اتفاق رہا اور مسلم پرسنل لا بورڈ ہی کیا، اقبال اکیڈمی، ملی کونسل، فقہ اکیڈمی وہ ہرجگہ متحرک رہے۔تحریر سے، تقریر سے وہ عمل پیہم کی تصویر بنے رہے۔خدا جانے کتنی تحریریں ان کے قلم سے نکلیں، دوسری طرف وہ فسادات کے شکار مظلوموں اور بے گناہ اسیروں کے لیے عدالتوں میں پیروی کرتے رہے۔مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسوں میں کبھی کبھی بڑے نازک مقامات بھی آتے لیکن وہ ایسے میں بھی بڑی آسانی سے گزر جاتے۔ان کی کتاب اور غالباً آخری کتاب بابری مسجد کے تعلق سے تھی جو اصلاً انگریزی میں تھی، اس کا ذکر حال ہی میں معارف میں بھی ہوا۔اپنے موضوع پر یہ منفرد کتاب ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو حسن قبول عطا فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل بخشے۔رحمھم اللہ۔ ع-ص

## ادبیات

# کشاکش

جناب محمد طارق غازی

فطرت اپنی طرف بلاتی ہے شاید انساں سے کچھ کہا ہے ابھی
کوئی اس کو سنے ، سنے ، نہ سنے وقت آواز دے رہا ہے ابھی

---

دل میں سرگوشیوں کی سن گن ہے ذہن کچھ راز کر رہا ہے عیاں
آنکھ غمزوں میں دے رہی ہے خبر ہے زباں پر حدیث شب کا بیاں

---

تہہ بہ تہہ رات اترتی جاتی ہے دور تک صبح کا پتا بھی نہیں
فتنہ فتنہ بکھر رہا ہے وجود اور گماں یہ کہ کچھ خطا بھی نہیں

---

لشکر قہر بڑھتا آتا ہے آندھیوں ، زلزلوں ، بگولوں میں
ابر لاتا ہے آتش نمرود آگ رکھی ہوئی ہے اولوں میں

---

خوں کی نہروں میں عقل کی کشتی جانے کس سمت بہتی جاتی ہے
کچھ نہیں اس میں اسلحہ کے سوا اب سیاست بھی صرف دھاتی ہے

---

ہر بڑی چھوٹی انجمن میں یہاں امن کے نام پر لڑائی ہے
عشق سگ میں ذلیل ہے اولاد ہونٹ پر گائے کی خدائی ہے

---

زہر آلود ہوگیا پانی قہر آلود ہوچکی ہے ہوا
موت سے جنگ کے نتیجے میں مرض افروز بن گئی ہے دوا

---

گنگ ہے شہر ، گنگ ہے صحرا کانا پھوسی ہے قصر و ایواں میں
روح میں کوئی بازگشت نہیں شور و غل ہے بدن کے دیواں میں

---

ڈائریکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس (USH)، ٹورانٹو، کینیڈا۔

دم اکھڑنے لگا ہے شہروں کا دہر نے پھر یہ راز کھولا ہے
ایسا پہلے بھی ہوچکا ہے یہاں یہی تاریخ کا ہنڈولا ہے

دور تہذیب کے ہیولوں میں آندھیاں کروٹیں بدلتی ہیں
زلزلے قہقہے لگاتے ہیں بجلیاں دم بدم مچلتی ہیں

پیش ناقہ وہی ثمود کی ضد ابر تقدیر عاد لکھتا ہے
کوچے کوچے میں، چپے چپے پر دست ہاماں فساد لکھتا ہے

گوشوارے تمام کذب و فریب جدولوں میں لکیریں سب کج مج
دجلِ ہشت زبان کا لقمہ جائزوں میں بیان کی سج دھج

بیج عاری ہوئے حرارت سے بانجھ فصلوں میں زندگی معدوم
علم غائب ہوا دماغوں سے جسم انساں میں آدمی معدوم

ساحلوں اور شاہراہوں پر عشق لیلیٰ کی آبرو نہ رہی
رات دن جسم میں بھٹکتے ہیں رمز ہستی کی جستجو نہ رہی

روح آزردہ، نفس پژ مردہ طیش، بیزاری، حزن، وحشت وحرب
فوج در فوج اک ہراسانی ہول، افسردگی، خشونت و کرب

خون افغان و مصر و شام و یمن اب ہلاکو کے ہاتھ پر مت دیکھ
سرخ ہے دامن اپنا، تیغ اپنی اپنی آنکھوں سے اپنی درگت دیکھ

جور حجاج کا نیا ڈھب ہے پھر زمیں پر کہیں پناہ نہیں
ہر نفس ہے ڈرون کی زد میں کون ہے جس کا گھر تباہ نہیں

خون ابنائے عم ہے پھر ارزاں تیغ سفاح بے نیام ہے پھر
باد وحشت میں پیچ کھاتا ہوا مردِ حُر مال کا غلام ہے پھر

کل کے چرواہوں کے تمدن میں دشت آباد، منزلیں ویراں
اپنے پیچوں میں راستے گم ہیں سوق و بازار عقل کے زنداں

رنگ اور صوت سے کھنڈر زندہ بستیاں دفن کچے خاکوں میں
ہوئے آباد کتنے ویرانے شہر اجڑتے رہے دھماکوں میں

دیکھ کر زر کی گرم بازاری دم بخود ہے ضمیر دنیا کا
فقر پر اقتصاد جس کا تھا وہ بھی ہے اب اسیر دنیا کا

نہ کلیسا نہ صومعہ نہ کنشت سیل اندوہ سے بچا نہ کوئی
مسجد و خانقاہ و مدرسہ تک محور دل پہ کیوں رہا نہ کوئی

وہ جو ہیں نامور قلم پارے میز محروم ان کتابوں سے
علم اسماء نہ شرع کا عرفاں سب ہے مفقود اب نصابوں سے

رہن ادوات سب شعور و عمل زیست آلات کی حقیر کنیز
مانگتی ہے خراج دانش سے کاخ تہذیب کی شریر کنیز

ہاں یہ سب ہے مگر کچھ اور بھی ہے ذہن مسجد میں با وضو ہے ابھی
مردنی روح اور جسد پہ سہی ملت علم میں نمو ہے ابھی

جہل کے موڑ سے پلٹ آنا ابن آدم کے اختیار میں ہے
ہجرت آباد کی پناہوں میں فطرت انساں کے انتظار میں ہے

دہر میں ہے ادل بدل کا نظام سلطنت پر کسی کا حق کب ہے
حوصلوں پر مدار قوت کا یہاں منصب امانت رب ہے

تو نہ اٹھا تو کون اٹھے گا خود کو کرتا ہے کیوں نظر انداز
تو نہ بولا تو کون سمجھے گا جان لے تو ہے دہر کا ہمراز

سونپ دے پیر مائی دھرتی کو سر پہ بس آسمان لے کے نکل
ساری دنیا میں سائے پھیلا دے دھوپ کے سائبان لے کے نکل

کر ستاروں سے پھر کشید ضیاء خاک تیرہ کو آسماں کر دے
حسن ترتیل کی نواؤں سے بے زبانوں کو پھر اذاں کر دے

# مطبوعات جدیدہ

**شبلی نعمانی، شخصیت اور عصری معنویت:** مرتب ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، نگراں پروفیسر سید محمد ہاشم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۳۲، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یوپی۔

علامہ شبلی کے ذکر میں فکر و نظر کی نئی نئی جہتوں کے تلاش کے مفید اور خوش گوار سلسلہ میں زیر نظر مجموعہ مضامین بھی ہے اور ممتاز و نمایاں شان سے ہے۔ گذشتہ سال علی گڑھ میں شعبہ اردو نے شبلی کی یادوں کی انجمن سجائی جس میں سرسید، علی گڑھ، مولانا شروانی، مولانا آزاد کے تعلق سے اور ادب و شعر و تنقید کے حوالہ سے شبلی کے افکار و خیالات زیر بحث آئے۔ یہ سارے مقالات اور مباحث اب اس کتاب میں بڑی خوش اسلوبی سے جمع کر دیے گئے ہیں۔ شعبہ اردو نے اپنے اس کام یا کارنامہ کو ''قرض کے طور پر ادا کرنے کی کوشش'' سے تعبیر کیا ہے، ادائے قرض اگر تہذیب اخلاق سے ہے تو واقعی اس سے سرسید اور خود علامہ شبلی کی روح، مسرور و مطمئن ہوگی۔ مقالہ نگاروں میں شعبہ اردو کے فاضل اساتذہ کے علاوہ اور بھی اہل قلم ہیں۔ لیکن خوبی مستزاد کچھ اہم مطبوعہ مضامین کی شمولیت ہے، قدیم تصورات اور جدید رجحانات کی روشنی میں شبلی کی شخصیت کی تابنا کی نے اس مجموعہ مقالات کو واقعی قدر کے لائق بنا دیا ہے۔

**شبلی اور آزاد (مراسم و تعلق کا اولین دور):** از ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۸۸، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: اپلائڈ بکس، ۱۰/ ۱۷۳۹ (بیسمنٹ) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلق کا عرصہ، دس گیارہ سال کا ہے۔ مگر ان کے درمیان ذہنی اور فکری مناسبتیں ایسی قوی ہیں اور ان کے اثرات اتنے وسیع ہیں کہ ان کو وقت اور مدت کے پیمانہ سے دیکھنا آسان نہیں۔ تاہم ایک محقق کی نظر میں جزئیہ بھی کسی کلیہ سے کم نہیں ہوتا، جہاں سے لوگ عموماً سرسری گزر جاتے ہیں وہاں بعض نگاہوں کے لیے رکنے اور ٹھہرنے کا پیغام بھی مل جاتا ہے۔ علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟ اس باب میں قریب پون صدی سے روایات کا اختلاف رہا۔ فاضل محقق کے سامنے اس بحث میں دو باتیں رہیں کہ اول تو ملاقات کے سنہ کا

تعین ہونا چاہیے، دوسرے یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ دونوں کا تعلق برابری کا تھا یا استاد و شاگرد کا۔ ان دو سوالوں کے جواب میں انہوں نے کئی مضامین لکھے جو دارالمصنّفین اور ساہتیہ اکیڈمی کے سمیناروں میں پڑھے گئے اور کچھ شائع بھی ہوئے۔ کہنے کو تو یہ آسان ہے کہ محقق نے تمام قرائن و شواہد سے ثابت کردیا کہ پہلی ملاقات کا زمانہ ۱۹۰۴ء کا ہے اور اس طرح اختلاف روایات کا مسئلہ حل ہوگیا، لیکن اس کے لیے انہوں نے جس دیدہ ریزی، ژرف نگاہی اور ہر مرجع و ماخذ کی ورق گردانی کی ہے۔ اصل یہی جستجو اور محنت ہے، اس مختصر کتاب کی سطر سطر سے یہی تاثر سامنے آتا ہے۔ بدایونی صاحب کو اپنے مطالعہ پر اعتماد ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ شبلی شناسی اور شبلی شعاری کے اس نئے دور میں وہ کہہ گئے کہ شبلی بڑے محققین کے التفات سے محروم رہے، اعلیٰ درجہ کا کام ہوا ہی نہیں۔ ماضی میں جو لکھا گیا، بعد والوں نے اسی کو قبول اور اختیار کیا۔ مولانا آزاد، شبلی کے معاصر، مکتوب الیہ، دوست اور ہمراز تھے لیکن اس تعلق کا جیسا مطالعہ کیا جانا چاہیے، نہیں ہوا۔ یہ کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے اور کہنا چاہیے کہ اپنے موضوع پر اس نے تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ نفس موضوع کے ساتھ ذکر شبلی کا لطف بھی ساتھ ساتھ ہے۔ یقیناً یہ مختصر کتاب، شبلیات میں بڑا اضافہ ہے۔

**خزینہ:** از جناب شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۴۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبۃ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ-۲۰۔

اس کتاب کے مولف بنگلور بلکہ جنوبی ہند کے ان نامور فرزندوں میں ہیں جن کو علمی و دینی، روحانی و عملی لحاظ سے دوسروں کے لیے نمونہ و مثال بننے کی توفیق الٰہی ملی ہے۔ وہ خانوادۂ رفاعیہ قادریہ کے صاحب سجادہ ہیں تو دوسری طرف مسلم پرسنل لا بورڈ اور ملی کاؤنسل جیسے ملی اداروں کے فعال رکن بھی ہیں۔ ندوہ کی مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے تعلیم اور یونیورسل پیس فاؤنڈیشن کے بانی رکن کی شکل میں عام سماجی ذمہ داریوں کو بھی نبھاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ کا دائرہ کتنا وسیع اور منتخب ہے وہ اس اسم بامسمیٰ کتاب کے مشمولات سے ظاہر ہے، جس میں انہوں نے علمی و فکری، اصلاحی و دعوتی مضامین کی بہترین، کارآمد، نفع بخش دولت جمع کردی ہے۔ قریب ایک سو نوے مضامین ہیں۔ ان کے لکھنے والوں میں مشاہیر ہیں اور نسبتاً کم معروف اہل قلم بھی ہیں۔ رفاعی صاحب نے دوران مطالعہ کتابوں اور مضامین کے خلاصہ کو لکھنے کی عادت ڈالی، یہ خلاصے ''شہ پارے''، ''ماحصل'' اور ''حاصل

مطالعہ'' کے نام سے شائع بھی ہوئے اور اب زیر نظر چوتھا حصہ خزینہ ہے۔ رفاعی صاحب نے یہ خزینہ اس لیے پیش کیا کہ یہ صرف مطالعہ و معلومات کے لیے نہیں بلکہ پڑھنے والے اپنی فکر مندی اور کار گذاری کے لیے ان کو لائحۂ عمل بنالیں۔ بروقت صحیح معلومات سے غور وفکر کے نئے زاویے بنتے ہیں کیا خوب فرمایا کہ جو شخص مقامی، ملکی، عالمی موافق و مخالف حالات سے واقف نہ ہوگا وہ محض اپنی ذات کا دیوانہ ہوگا جب کہ امت محمدیہ کو عام نفع رسانی کے لیے وجود بخشا گیا ہے۔ کتاب واقعی خزینہ ہے۔

**نے نوازی:** از جناب سعید الظفر چغتائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد گرد پوش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: یونیورسل بک ہاؤس، ۳۔ عبدالقادر مارکیٹ، علی گڑھ اور علی گڑھ کے دوسرے مشہور مکتبے۔

علامہ اقبال نے نے نوازی کے لیے کلیم یا حکیم کا انتخاب کیا کہ یہی امتوں کے ضمیر کو پاک کر سکتے ہیں۔ غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا یہ مجموعہ اقبال کے حرف حکمت کی صداقت کی گویا وضاحت ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کو کمال نے نوازی سے تعبیر کیا تھا لیکن اس شکوہ کے ساتھ کہ یہ مرے کام کچھ نہ آیا۔ یہ غالباً ان کا کمال انکسار تھا۔ اس مجموعہ کے حکیم شاعر نے اگر اس شعر کو سر دیوان بنایا تو یہ بھی انکسار ہی کا عمل ہے۔ ۵۵ء سے ۲۰۰۷ء تک کا یہ شعری سرمایہ، رسمی شاعری کی کل کائنات نہیں، چغتائی صاحب علم طبیعیات میں دور دور شہرت رکھنے والے سائنس داں ہیں، لیکن یہ چغتائی نسبت کا اثر ہے کہ ۵۵ء میں جب غالباً انہوں نے سائنس کی دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا ان کے لب پر دعا تھی:

فزوں تر ہو ہر روز سوز محبت    یہ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی کم ہے
میں پھر چھیڑ دوں تار دل، جان ہستی    کہ مدت سے یہ ساز بے زیر و بم ہے

۲۰۰۷ء آتے آتے شعور نے یہ اعتراف کیا کہ:

تخییل میں، نظر میں، خبر میں، شنید میں    ہے کوئی جلوہ بیز تو تصویر یار کی

نصف صدی میں وہ کہاں کہاں سے گزرے، تلاش یا پھر یافت کی یہ شعری داستان، عام شعری مجموعوں سے بالکل جدا ہے کیوں کہ

اسی تلاش سے میری حیات قائم ہے    یونہی حیات یونہی کائنات قائم ہے

شاعر کو جو ملنا تھا وہ صحیح ہے کہ اسی وقت مل گیا جب اس نے شعر کہا، پڑھنے والوں کو بھی یہی کہنے کا حق ہے۔

ع ۔ ص

# رسید کتب موصولہ

۱۔استدراکات: مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی،مکتبہ نعیمیہ،صدر بازار،مئوناتھ بھنجن۔

قیمت:درج نہیں

۲۔اقبال کی نظمیں نوجوانوں اور جلسوں کے لیے: ابن غوری،11-3-946،امتیاز ریزیڈنسی چوراہا، نیو ملے پلی،حیدر آباد۔۱۔

قیمت:۶۰/روپے

۳۔تفہیم تصوف: حسین الحق،سرسید کالونی،نیو کریم گنج،روڈ نمبر۔۲،گیا۔

قیمت:۲۵۰/روپے

۴۔تنقیدات محمود(اول): ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی،بی ۱۰۴،بدر منزل،پٹیل نگر،ونجار پٹی ناکہ، بھیونڈی،ضلع تھانہ۔

قیمت:۲۰۰/روپے

۵۔جلوۂ ارزانی: ڈاکٹر سید شاہ ہمایوں اختر،خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی،پٹنہ۔

قیمت:۲۰۰/روپے

۶۔چین کا سفر: فیصل احمد ندوی،مکتبۃ الشباب العلمیہ،لکھنؤ۔

قیمت:۱۰۰/روپے

۷۔حدیث نبوی اور دور حاضر کے فتنے: مولانا محمد یوسف کاندھلوی،تخریج مفتی محمد شعیب اللہ خاں،فیصل پبلیکیشنز،جامع مسجد،دیوبند۔

قیمت:۱۳۰/روپے

۸۔رموز تحقیق: ڈاکٹر سید شاہد اقبال،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔

قیمت:۱۴۶/روپے

۹۔شبلی،مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلما: ڈاکٹر عمیر منظر،اپلائڈ بکس،دہلی۔

قیمت:۳۰۰/روپے

۱۰۔صحبتے با اولیا: مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی،جامعہ اسلامیہ،مظفر پور،اعظم گڑھ۔

قیمت:۲۰۰/روپے

(گذشتہ شمارہ میں نمبر ۵ کی صحیح عبارت یہ ہے ’’ڈپٹی کلکٹر حافظ محمد عرفان خاں صاحب‘‘)

# تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن) | 2000/- |
| سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) | 2200/- |
| علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی | |
| مقدمہ سیرۃ النبیؐ | 30/- |
| الفاروق | 300/- |
| الغزالی | 200/- |
| المامون | 100/- |
| سیرۃ النعمان | 300/- |
| سوانح مولانا روم | 80/- |
| شعر العجم اول | 150/- |
| شعر العجم دوم | 130/- |
| شعر العجم سوم | 125/- |
| شعر العجم چہارم | 150/- |
| شعر العجم پنجم | 120/- |
| الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی | 350/- |
| (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | |
| الکلام | 230/- |
| علم الکلام | 180/- |
| موازنہ انیس و دبیر | 100/- |
| اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر | 85/- |
| سفر نامہ روم و مصر و شام | 200/- |
| کلیات شبلی (اردو) | 180/- |
| کلیات شبلی (فارسی) | 45/- |
| مقالات شبلی اول (مذہبی) | 100/- |
| مرتبہ: سید سلیمان ندوی | |
| مقالات شبلی دوم (ادبی) // | 70/- |
| مقالات شبلی سوم (تعلیمی) // | 80/- |
| مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) // | 200/- |
| مقالات شبلی پنجم (سوانحی) // | 150/- |
| مقالات شبلی ششم (تاریخی) // | 90/- |
| مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) // | 100/- |
| مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) // | 110/- |
| خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی | 80/- |
| انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی | 45/- |
| مکاتیب شبلی اول // | 150/- |
| مکاتیب شبلی دوم // | 190/- |
| شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 220/- |

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
FEB 2016 Vol- 197 (2)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
(Office Mobile) 07607046300 / 09170060782

## تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن) | | علامہ شبلی نعمانی | 2000/- |
| ۲۔ | شبلی کی آپ بیتی | | ڈاکٹر خالد ندیم | 325/- |
| ۳۔ | دارالمصنّفین کے سو سال | | کلیم صفات اصلاحی | 350/- |
| ۴۔ | شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات) | | مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 220/- |
| ۵۔ | الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی | | علامہ شبلی نعمانی<br>تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | 350/- |
| ۶۔ | محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس | | ڈاکٹر جاوید علی خاں | 230/- |
| ۷۔ | سیرت عائشہ | (ہندی ترجمہ) | علامہ سید سلیمان ندوی | 325/- |
| ۸۔ | عرب وہند کے تعلقات | (ہندی ترجمہ) | // // | 200/- |
| ۹۔ | خطبات مدراس | (ہندی ترجمہ) | // // | 125/- |
| ۱۰۔ | دین رحمت | (ہندی ترجمہ) | مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی | 200/- |
| ۱۱۔ | ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول | (ہندی ترجمہ) | سید صباح الدین عبدالرحمن | 125/- |
| ۱۲۔ | ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم | (ہندی ترجمہ) | // // | 180/- |
| ۱۳۔ | ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم | (ہندی ترجمہ) | // // | 225/- |